# علامہ اقبال

## افکار و خیالات

مرتبین

مصباح الحق صدیقی

تسنیم کوثر گیلانی

# علّامہ اقبالؒ

## (افکار و خیالات)

مرتّبین

مصباح الحق صدیقی : تسنیم کوثر گیلانی

فرحان پبلشرز لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

Acc. No. 934

سال طباعت ——— جون ۱۹۷۷ء
طبع ——— اوّل
تعداد ——— ۱۰۰۰
ناشر ——— فرحان پبلشرز لاہور
۱۔ جان محمد روڈ انارکلی لاہور
مطبع ——— شرکت پریس
چوک نسبت روڈ۔ لاہور

قیمت ——— ۳۰/- روپے

ملنے کا پتہ
آئیڈیل بک ہاؤس
انارکلی۔ لاہور

# فہرست مضامین


| مضمون | مصنف | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| گزارش احوال | تسنیم کوثر گیلانی۔ مصباح الحق صدیقی | ۵ |
| مقدمہ | خواجہ عبدالرشید (ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل) | ۷ |
| ۱۔ اقبال اور احترام آدم | جگن ناتھ آزاد | ۱۱ |
| ۲۔ علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت | خواجہ عبدالرشید۔ (ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل) | ۱۸ |
| ۳۔ عورت کا صحیح مقام اقبالؒ کی نظر میں | رشید شیدائی | ۲۹ |
| ۴۔ اقبالؒ اور حسنِ معاشرت | صلاح الدین احمد (مولانا) | ۳۷ |
| ۵۔ نظم مسجد قرطبہ | صوفی غلام مصطفیٰ تبسم | ۴۸ |
| ۶۔ اسلامی فکر و عمل کا معمارِ نو | ڈاکٹر غلام جیلانی برق | ۵۸ |
| ۷۔ سودیشی تحریک اور رہبرانِ اسلام (علامہ اقبالؒ کا ایک نایاب مضمون) | علامہ اقبالؒ | ۶۵ |
| ۸۔ ہمارا قومی شاعر ـــــ اقبالؒ | قائدِ اعظم محمد علی جناح | ۷۰ |
| ۹۔ علامہ اقبالؒ اور طب اسلامی | حکیم محمد حسن قرشی | ۷۳ |
| ۱۰۔ اقبالؒ کی ایک پیش گوئی | محمد سرور | ۸۰ |
| ۱۱۔ اقبالؒ کا سیاسی پس منظر | محمد ولایت علی خان | ۹۷ |
| ۱۲۔ اقبال پرستی سے اقبال شناسی تک | مشفق خواجہ | ۱۱۳ |
| ۱۳۔ امتِ مسلمہ کے اتحاد کی بنیاد | مصباح الحق صدیقی | ۱۲۵ |
| ۱۴ سکون و حرکت اقبالؒ کی نظر میں | ممتاز حسن | ۱۳۳ |
| ۱۵۔ اقبالؒ کی شاعری | ڈاکٹر وحید قریشی | ۱۴۴ |
| ۱۶۔ اقبالؒ کا پیغام عورت کے نام | سید یونس شاہ | ۱۵۳ |
| ۱۷۔ اقبال کے نقاد | تسنیم کوثر گیلانی | ۱۶۴ |

# گذارش احوال

علاّمہ ڈاکٹر محمد اقبال ان برگزیدہ عزت مآب اور جلیل القدر ہستیوں میں سے ہیں جن کی یاد قیامت تک دل کی دھڑکنوں میں رچی بسی اور کروٹیں لیتی رہے گی۔ اس بات سے انکار نہیں کہ سید جمال الدین افغانی کے بعد علاّمہ اقبالؒ ہی وہ واحد فرد تھے جنہوں نے مشرق کے تنِ مُردہ کو زندگی کی حرارت سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنی تمام تر زندگی وقف کردی۔ صدیوں سے بے عملی اور غلامی و ذلّت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مسلمان قوم کے جسم بے جان میں جرأت و ہمت عزم و حوصلہ اخلاص و حرّیت اور خودی و عمل کی ایسی روح پھونکی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک غلام قوم آزادی و خود مختاری کے آسمان پر ایک روشن اور تابندہ ستارہ بن کر ابھری پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مشرق کے اس مسیحا نفس کی آواز بازگشت نیل کے ساحل سے تا بخاک کاشغر سُنائی دینے لگی۔

علاّمہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے سلسلہ میں ہم نے اقبالیات کے ادنےٰ

طالب علم ہونے کی حیثیت سے پُرانے اخبارات و رسائل سے مضامین مرتب کر کے کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اُمید ہے اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اور طالب علم زیرِ ترتیب مجموعے سے استفادہ کریں گے۔

ہم ان اہلِ قلم کے تہہ دل سے ممنون ہیں جن کے رشحاتِ قلم ان کی اجازت کے بغیر اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں۔ اور شاید وہ بھی ہمارے ممنونِ احسان ہوں کیوں کہ ان کی گراں قدر تخلیقات کو کتابی شکل میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ ان تک عام قاری کی رسائی ناممکن تھی۔ اور شاید اخبارات و رسائل کے ڈھیر میں تلف ہو جانے کا احتمال بھی تھا۔

آخر میں ہم جناب خاور مرزا صاحب کے بھی ممنون ہیں جو ہماری تالیفات کی طباعت کی تمام تر ذمہ داریاں رضاکارانہ طور پر سنبھالنے کے باوجود شکریہ ادا کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری تالیفات کی طرح اس کی طباعت بھی ان کی معاونت کے بغیر ناممکن تھی۔ اس کے ساتھ جناب اکرام چغتائی صاحب کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا۔

لاہور۔ ۱۹/۵/۷۷

مصباح الحق صدیقی

و

تسنیم کوثر گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدّمہ

مصباح الحق صدیقی اور تسنیم کوثر گیلانی کی یہ پیش کش قابلِ تحسین ہے انہوں نے اقبال کے صد سالہ جشن میں اس کی اشاعت سے ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ پر بھی یہ احسان کیا ہے کہ میرا یہ انا مقالہ شاملِ مجموعہ کر لیا ہے۔ اور اب وہ مجھے یہ کہہ کر کہ اس کا مقدمہ لکھ دوں مجھ پر اور کرم فرمائی کر رہے ہیں اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ مجموعہ اس بات کی عکاسی کر رہا ہے کہ اقبال کی پہلو دار شخصیت نے قوم کو جگانے میں کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہیں کیا مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دعوے بہت کرتے ہیں مگر عمل سے گریز کرتے ہیں ہماری گفتار بہت بڑھ گئی ہے مگر کردار نظر انداز کر دیا گیا ہے اقبال کا اصل مقصود قرآن کی روشنی میں کردار کو بلند کرنا تھا گفتار سے کچھ نہیں بن سکتا زیادہ سے زیادہ انسان افسانہ نگار یا شاعر بن سکتا ہے مگر کردار سے انسان مجاہد بن سکتا ہے

اسلام کو اس وقت مجاہدوں کی ضرورت ہے شاعروں کی نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ جب ہم نے قرآن ہی کو نظر انداز کر دیا ہے ہم اقبال کو کیسے سمجھیں گے۔

جناب آصف علی ارمغان آصف میں لکھتے ہیں "حکیمانہ زاویہ نظر قائم کر کے دیکھا جائے تو مجموعی طور پر اقبال کو اپنی نوع کا آدم ماننا پڑے گا۔"

بہت درست کہہ دیا ہے انہوں نے اسلام میں اس وقت تک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس قدر بھی مفکر پیدا ہوئے ہیں اقبال کا مقام ان سب سے بلند ہے اس نے تین زبانوں میں قرآن کی عملی تفسیر کی ہے اور وہ جدید و قدیم فکر سے آشنا تھے وہ زمانے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کی تفسیر کرنے کے اہل تھے۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ طور پر تفسیر کوئی نہیں لکھی مگر قرآن کے تمام اہم پہلو اور مسائل اجاگر کر دیئے ہیں قوم کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے اور جاتے جاتے کہہ گئے ؏

در نسِ ملت عثمانیاں دوبارہ بلند
چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد ست

یہی صرف نہیں کہا بلکہ وہ اس قدر قوم کے کردار سے مایوس ہو چکے تھے کہ ان کی آنکھیں خونی آنسوؤں سے اشکبار تھیں۔ ؏

درونِ دیدہ نگاہ دارم اشک خونیں را
کہ من حقیرم و ایں دولت خدا داد ست

وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت حشر کے روز جو وہ اللہ تعالیٰ سے کریں گے بالکل بجا ہو گی قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ

اِنَّ قومی اتّخذوا ھٰذا القرآنَ مھجوراً۔ اس لئے اقبال نے کہا ع

خدا را نہ مہجوری قرآن شدی

شکوہ سنج گردش دوران شدی!

تم نے تو قرآن کو نظر انداز کر دیا ہے مگر دعویٰ ہر قسم کی پارسائی کا کر رہے ہو تمہارے چہرے پر رسولِ کریم کی سنت بکھری ہوئی ہے مگر ہاتھ میں تمہارے مہاتما بدھ کی مالا لٹک رہی ہے اپنے کردار کو نہیں روتے اپنی قسمت کو روتے ہو اور نہ معلوم یہ تقدیر کو قسمت مسلماں نے کس طرح بنا دیا ہے یا للعجب !!!

اقبال کی طبیعت نہ تھی محیط کائنات کا کیف تھی - ذہن نہ تھا خمخانۂ حیات کا جوش تھا - خیال نہ تھا عنقائے آگہی کا آشیانہ تھا اور کیوں نہ ہوتا ادھر خداداد ذہانت اور صلاحیت کا ہونا ادھر مغرب و مشرق کے علم و فیض اور سیاحت کا سو ہاگہ -" (ارمغان آصف)

گویا ہر لحاظ سے ان تمام مفکرین میں صفِ اول کے وسط میں اقبال امامت کر رہے ہیں اگرچہ ان تمام صفِ اول کے مفکرین اور دانشمندوں کا ذکر اقبال اپنے کلام میں ضرور کرتے ہیں مگر ان تمام میں اقبال کا مقام امامت ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ابھی تک اقبال پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر عمل نہیں ہوا - عمل کیسے ہو ؟ اقبال تو جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآنِ حکیم کی تفسیر کر رہا ہے اور قرآن کو ان لوگوں نے نظر انداز کر رکھا ہے تو پھر عمل کیوں نہ مفقود ہو - اور اقبال کو کیوں کر سمجھیں - یہ مجموعہ انتخاب مقالات ان مشکلات کو حل کرتا ہے اگر عمل کا ارادہ ہو -

اقبال نے تمام اہم مسائل پر جدید طریق سے نگاہ ڈالی ہے اور مسلمانوں

کو یہ مسائل سمجھانے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کی تاویلیں فرسودہ تھیں یہ مسائل تقدیر بھی تھے اور خیر و شر بھی تجدد امثال بھی تھا اور وجودیت بھی، ظاہر ہے ان تمام مسائل پر مسلمان بھٹک کر اہل راہ سے علیحدہ ہو گئے تھے - اقبال نے ان کو راہِ راست پر لانے کی تلقین کی جب وہ یہ اونچی قسم کی باتیں اُردو میں نہ سمجھ سکے تو اس نے ان کے لئے فارسی زبان اختیار کی اور جب فکر اور بلند ہو کر جدید فضا میں اڑنے لگا - تو اس نے اپنے مقالات انگریزی میں تحریر کئے تاکہ ان کی حقیقت بین الاقوامی بن جائے مگر افسوس کہ اس کو کسی بھی ایک زبان میں نہ سمجھا اگر سمجھا ہوتا تو جس تحت الثریٰ میں مسلمان آج گر پڑا ہے یہاں نہ ہوتا اس کا مقام بہت بلند ہوتا ہر جگہ "فی سبیل اللہ فساد" نظر آرہا ہے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ "لاتفسدو فی الارض بعد اصلاحھا"

چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتادست (اقبال)

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں (سعدی)

۵۱/۲ علاؤالدین روڈ
لاہور چھاؤنی

خواجہ عبدالرشید
۲۱ مئی ۱۹۷۷ء

جگن ناتھ آزاد

# اقبال اور احترامِ آدم

اقبال ہر اعتبار سے ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ہم اقبال کے خیالات سے ہمیشہ متفق ہوں یا نہ ہوں، ان کے خیالات کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتے اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ انسانیت کی بلندی سے کہی ہے۔ اقبال صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں بلکہ اس کے حصول کے لئے طریق کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ عظمت کے اسی تصوّر نے اقبال کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے کسی طرح حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال کا کلام ایک انسان کا کلام ہے اور اسے اسی خیال سے پڑھنا لازمی ہے۔ اس کلام پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری نہیں بلکہ دوسرے بڑے شعرا کے کلام کی طرح ہمیں اس کے حسن و قبح کو اپنی پرکھ کی کسوٹی پر دیکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں

ہمیں غلط اندیشیاں بھی نظر آسکتی ہیں ہم بعض نظریات سے اختلاف بھی کرسکتے ہیں لیکن اس فن کار کا کمال یہ ہے کہ ہم کہیں بھی کلام اقبال کی عظمت سے منکر نہیں ہو سکتے ۔ فکر اقبال میں یہ عظمت اقبال کے اس بنیادی عقیدے سے پیدا ہوئی ہے کہ انسان عظیم ہے اور جادہ عظمت پر گامزن ہے اقبال کے کلام کو ہم مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اسے صحیفہ عظمت آدم کے سوا اور کوئی نام نہ دے سکیں گے۔ عظمتِ آدم کے موضوع پر ان کے یہ اشعار تو زبان زدِ عام ہیں ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

خبر ملی ہے یہ معراج مصطفٰے سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

"جاوید نامہ" کی تمہید آسمانی میں یہی خیال اقبال نے کچھ اور سحر انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

فروغ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے
خیال او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ ریزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

"جاوید نامہ" کا ذکر آتے ہی اسی نوع کی ایک اور کتاب کا تصور لازمی طور پر ذہن میں آجاتا ہے۔ اور وہ ہے اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی "کامیڈی" جو آج "ڈیوائن کامیڈی" کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں کہ اقبال نے "جاوید نامہ" کا خاکہ "ڈیوائن کامیڈی" سے مستعار لیا ہے۔ مجھے اس دعویٰ کو صحیح تسلیم کرنے میں قدرے تامل ہے اس لئے کہ ڈانٹے کی تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" سے قبل شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحات مکیہ" اور ابوالعلا معری کی تصنیف "رسالۃ الغفران" منظر عام پر آچکی تھیں۔ یہ تصانیف اقبال کے سامنے بھی موجود تھیں اور ڈانٹے کے سامنے بھی۔ خیر یہ بات یہاں ایک جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہنا میں کچھ اور چاہتا ہوں "۔ ڈیوائن کامیڈی" میں ڈانٹے اپنی محبوبہ بیٹریسی کی تلاش میں جاتا ہے اور "جاوید نامہ" میں اقبال حق کی جستجو میں نکلتا ہے۔ ڈانٹے عیسائی تھا۔ اور اقبال مسلمان، محض لفظی اعتبار سے نہیں بلکہ معنوی اعتبار سے بھی، ڈانٹے کی کتاب میں غیر عیسائیوں کا ذکر موجود ہے اور اقبال کی کتاب میں غیر مسلمانوں کا لیکن ؎ ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

جہاں غیر عیسائیوں کے ذکر میں ڈانٹے صبر اور ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر کف بدہن ہو جاتا ہے وہاں اقبال غیر مسلموں کا ذکر اس احترام سے کرتا ہے جس احترام سے کسی مسلمان کا۔ شوجی مہاراج۔ گوتم بدھ، بھرتری ہری اور منہرو خاندان کا ذکر اقبال نے "جاوید نامہ" میں کیا ہے۔ اور رسول اللہؐ اور حضرت علی کا ذکر "ڈیوائن کامیڈی" میں ڈانٹے نے کیا ہے ان کے علاوہ "ڈیوائن کامیڈی"

میں ان شخصیتوں اور عظیم انسانوں کا تذکرہ بھی موجود ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل اس دنیا میں آئے ۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈانٹے کے مرشد ورجل کا زمانہ بھی حضرت مسیح سے پہلے کا زمانہ ہے ۔ ڈانٹے نے اپنے مذہبی تعصب کے جوش میں ان میں سے کسی کو معاف نہیں کیا جو عظیم ہستیاں عیسائیت سے قبل اس دنیا میں آئیں اگرچہ انہیں ڈانٹے نے دوزخ کے مرکز میں نہیں دکھایا ہے لیکن اس کے حدود میں دکھانے سے گریز نہیں کیا ۔ وہاں ان کے لئے ڈانٹے نے عقل انسانی کا ایک قلعہ بنایا ہے ۔ یہاں یہ علم و ادب کے آفتاب گھاس پر بیٹھے نظر آتے ہیں ۔ یہ سارا ماحول عقل کی روشنی سے جگمگا رہا ہے ۔ چونکہ یہ ہستیاں عیسائیت سے قبل عالم وجود میں آئیں اس لئے ڈانٹے نے ان کے لئے جو مقام تجویز کیا ہے ۔ وہ دوزخ ہے ۔ نیز ان کے لئے یہ طے کر دیا ہے کہ یہ جلوۂ الٰہی سے کبھی فیض یاب نہیں ہو سکتیں اور یہ ہمیشہ نامراد اور نا امید رہیں گی ۔

رسول اللہ اور حضرت علی کا ذکر ڈانٹے نے اس کتاب میں جس انداز سے کیا ہے وہ علم و ادب کے طالب علموں کے لئے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے میں اس حصّہ کو " نقل کفر کفر نہ باشد " کا سہارا لے کر بھی یہاں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا ۔ سوال مذہبی بحث کا نہیں ہے بلکہ محض اس قدر ہے کہ کیا ادب العالیہ کسی دور میں بھی اس غیر مہذب لب و لہجہ کا متحمل ہو سکتا ہے ۔

شاعر کی اس تنگ نظری نے ورجل کو بھی نہیں بخشا ہے ۔ یہ ہے پیر و مرشد کا روحانی رشتہ ۔

اس کے خلاف اقبال کی زبانی شوجی مہاراج ، گوتم بدھ اور بھرتری ہری کا ذکر سنیئے ! ادب و احترام کے کون سے موتی ہیں جو اقبال نے ان شخصیتوں پر نچھاور نہیں

ے۔ اور ایک ایسے عالم میں جبکہ جلال الدین رومی ، اقبال کو اپنی راہنمائی میں افلاک
سیر کرا رہے ہیں۔ اقبال نے شوخی مہاراج سے روحانیت کا درس لینے میں فخر
سوس کیا ہے اور اس درس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دی ہے۔ اقبال کا عظمت
دم کا تصوّر محض خالی خولی جذباتی قسم کا تصور نہیں بلکہ ایک گہرا اور رچا ہوا تصوّر
ہے جس سے کلام اقبال اوّل سے آخر تک جگمگا رہا ہے ؎

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

ے عقیدے پر اقبال مضبوطی سے قائم ہیں یہ تصوّر کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہے
ام آدمی اقبال کی نظر میں کس قدر بلند ہے اس کا اندازہ ایک شعر نقل کر دینے
ے نہیں ہو سکتا اس کے لئے اقبال کے فلسفہ حیات کا غائر نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔

انسان کو قدم قدم پر مسائل حیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے حوادث اکثر حوصلہ شکن
ی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ حوصلہ شکنی انجام کار انسان کو بے یقینی اور مایوسی کی طرف
جاتی ہے اقبال یہاں انسان کی رہنمائی کے لئے آتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں ؎

شاخ نہال سدرہ خار و خسِ چمن مشو
منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو

---

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد
این مشت غبارے را انجم بہ سجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینہ ہستی بود
از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد

همہ ستارہ کہ در راہ شوق ہم سفر اند
کرشمہ سنج و ادا فہم و صاحب نظر اند
چہ جلوہ ہاست کہ دیدند در کف خاکے
قفاز جانب افلاک سوئے ما نگرند

یہ تمام اشارے ہیں اس حقیقت کی جانب کہ انسان کو نظام کائنات میں ایک خاص منصب عطا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عظمت آدم میں جہاں اس قدر اعتماد اور یقین کا اظہار ہوگا۔ وہاں قنوطیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ انسان کے رگ وپے رجائیت کے ولولے سے معمور ہوں گے اور اقبال کا آدم، عمر خیام کے آدم سے کہیں مختلف ہوگا۔ جس کا ذکر خیام رباعیات میں کرتا ہے۔

آمد سحرے ندا ز میخانہ ما
کاے رندخراباتی و دیوانہ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیالہ زمے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانہ ما

---

من بادۂ جام یک منی خواہم کرد
خود را بہ دروجام مے غنی خواہم کرد
اول سہ طلاق عقل خواہم گفت
پس دختر رز را بہ زنی خواہم کرد

آں ہا کہ محیط فضل و آداب شدند
در کشف علوم شمع احباب شدند
رہ زیں شب تاریک نہ بردند بروں
گفتند فسانہ در خواب شدند

خیام کی تو خیر بات ہی مختلف ہے اقبال کا عظمت آدم کا تصور غالب کے اس نظریئے کی بھی تردید ہے کہ

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آفاق ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء

(ریٹائرڈ) لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

# علاّمہ اقبال کی قرآنی بصیرت

حضرت اقبال کی صد سالہ تقریب کے لئے آپ (خواجہ عبدالرشید) نے اردو میں جو مقالہ بعنوان "علاّمہ اقبال کی قرآنی بصیرت" لکھا ہے، وہ آپ نے بڑی محنت سے لکھا ہے، مجھے بہت پسند آیا ہے ——— (سیّد عبداللہ)

علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا موضوع ہی قرآن اور انسان ہے۔ جس تحقیق سے آپ نے ان دو چیزوں کو سمجھا ہے یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ اس سے پہلے ہمارے مفسرین اور فلسفیوں کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیسویں صدی میں علوم نے انتہائی ترقی کر لی تھی اور جو جو انکشافات اور ایجادات اس صدی میں ہوئے اس سے پیشتر ان تمام صدیوں میں مجموعی طور پر نہ ہوئے تھے، اس لئے علاّمہ اقبال کی نگاہ قرآن اور انسان پر بڑی وسیع تھی۔ متقدمین نے ان موضوعات پر جو روشنی ڈالی وہ قدما کی تقلید میں تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان پر تحقیق کی راہیں نہ کھلی تھیں۔ نئی راہوں کے

کُھلنے سے آیاتِ قرآنی پر روشنی پڑی، اور تاریخ کے جن مراحل سے ہو کر یہ قوم گزری تھی۔ اس کے تنزّل کے اسباب بھی کھُل کر سامنے آگئے تھے، جو عقائدِ فروعی تھے ان کی حقیقت بھی نکھر کر سامنے آگئی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال کو قرآنِ حکیم پر غور و فکر کرنے کا زیادہ موقع ملا تھا اور چونکہ وہ مغربی علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کے لئے ہر عقیدے کو پرکھنا آسان ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا مقام پا لیا تھا جہاں کھڑے ہو کر وہ ایک طائرانہ نظر تمام عالمِ اسلام پر ڈال سکتے تھے اور ہر مسئلہ کو اپنے نئے رنگ اور روشنی سے دیکھ سکتے تھے۔ اقبال کا شعور ان بہت سے لوگوں سے زیادہ بیدار تھا جو اس سے پہلے ہو گزرے تھے۔ اقبال نے بڑی گہرائی تک پہنچ کر قرآنِ حکیم میں غوطہ زنی کی ہے۔ تب ہی تو اُس نے کہا تھا کہ

"ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!" اور ع "ایں کتاب از آسمانِ دیگر است!!"

یہ بات اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اقبال نے قرآن کے مغز کو پا لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے برملا کہا تھا کہ ع

گر تو می خواہی مسلماں زیستن  نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہ کوئی معمولی حقیقت نہ تھی جو اس نے پا لی تھی۔ بلکہ اس نے اس آیت کریمہ پر بخوبی غور و فکر کے بعد یہ بات کہی تھی۔

وھو ھذا — قال الرسول یارب اِنَّ قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورًا اس حقیقت کو علامہ اقبال پا گئے تھے کہ اس شکایت کے کیا معنی ہیں اور مسلمان قرآن کو چھوڑ کر کن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اُن کا یہ

شعر قرآن حکیم کی اس آیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ع

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنج گردش دوراں شدی؟

وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان زمانے کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے اور اپنے تنزل کا ذمہ دار زمانے اور تقدیر کو ٹھہرا رہا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے قرآن حکیم کی ایک عملی تفسیر پیش کی جو ان کے اشعار کے اندر بکھری پڑی ہے۔ علامہ کے تمام کلام میں خواہ وہ اُردو ہو یا فارسی کوئی نہ کوئی قرآنی آیت کا ٹکڑا منسلک ہوتا ہے۔ اور کسی نہ کسی مسئلے کا حل پیش کر دیتے ہیں اور وہ اشاروں اشاروں میں حقیقت کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ایک آدھ مثال سے کام نہیں چل سکتا تمام کلام پر نگاہ ہونی چاہیئے۔

علامہ اقبال کے تمام کلام کو مجموعی طور پر تفسیر قرآن سمجھنا چاہیئے۔ اس مختصر سے مقالے میں تمام ایسے شعروں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جائے گا جو زیادہ موزوں اور موضوع کے مطابق ہوں گے۔ ان کی یہ تفسیر جیسا کہ ہم نے کہا ہے عملی تفسیر ہے، یہ بات ان کے صرف منظوم حصّہ ہی سے عیاں نہیں۔ بلکہ ان کی انگریزی نثر یعنی خطبات میں بھی جا بجا بکھری ہوئی ملتی ہے۔ اس کے متعلق ایک جرمن عالم نے کہا تھا "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ عصرِ حاضر کا سب سے زیادہ تعجب انگیز مظہر ہے۔" علامہ اقبال نہ صرف تفسیر کی پہلوؤں کو ہی راہِ راست پر لائے تھے بلکہ آیاتِ قرآنی کے بعض مفاہیم پر بھی نظرِ ثانی کی تھی اور ان کو نئے معنیٰ پہنا کر ایک تازہ حقیقت کو اجاگر کر دیا تھا۔ مثلاً ان خطبات میں ایک مقام پر وہ اس آیت

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت - میں ابل کا ترجمہ بجائے اونٹ کے بادل کرتے ہیں - ہمارے مترجمین نے اونٹ ہی ترجمہ کیا ہے، حالانکہ قرآن حکیم میں ابل[1] کا لفظ بارش اور بادل کے لئے بھی مستعمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بادل ہی ترجمہ کیا جائے نہ کہ اونٹ، اگر اللہ میاں کو اپنی تخلیق ہی کا نمونہ دکھانا مقصود تھا تو انسان کا نام لے دیا ہوتا جو یقیناً اونٹ سے بہتر ہے - مترجمین یہ کہتے ہیں کہ ریگستان کے باشندوں کے لئے اونٹ کی اہمیت زیادہ ہے - ایسی کوئی بات نہیں - بادل بھی اتنے ہی اہم ہیں بلکہ اونٹ[2] سے بھی زیادہ اہم ہیں اور اس کی اہمیت خشک اور بنجر ریگستان میں زیادہ واضح ہے اور پھر آیات کا نزول ایک خاص ترتیب

---

[1] قرآن مجید میں صرف دو جگہ لفظ "ابل" آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے ایک ہی معنی (اونٹ) کیے گئے ہیں -

[2] مشہور روایت ہے کہ کسی نے ایک بدو سے پوچھا تھا کہ تم کیا کھاتے ہو؟ اس نے کہا "اونٹ" کیا پیتے ہو؟ "اونٹ"، کیا پہنتے ہو "اونٹ" کہاں رہتے ہو "اونٹ میں" ایندھن کیا ہوتا ہے؟ "اونٹ" وغیرہ وغیرہ — سائل نے حیران ہو کر کہا — "تمہارا ہمہ اوست اونٹ ہی ہے؟ ذرا کھول کر بتاؤ"— بدو نے کہا — "اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں، اس کا دودھ پیتے ہیں، اس کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں - اس کی کھال کے ساختہ خیموں میں رہتے ہیں - اس کی مینگنوں کے ایندھن سے چولھا گرم کرتے ہیں" وغیرہ وغیرہ — اس کے علاوہ عرب جاہلیت کی شاعری میں تشبیہات کے انبار میں اونٹ سے بہت کام لیا گیا اور اونٹ کی مختلف حالتوں، عمروں اور قسموں کے متعلق الگ الگ سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں -

اور سیاق و سباق سے ہو رہا ہے، آسمان، پہاڑ اور زمین، اس میں بادل بالکل موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اونٹ یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے یہاں اونٹ کی بجائے بادل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

علامہ اقبال اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ علماء اسلام نے یونانی علوم سے متاثر ہو کر قرآن کی تفسیریں کی ہیں۔ مگر اب وہ زمانہ گزر چکا ہے اور جدید سائنسی تحقیقات نے قرآن حکیم پر بے انداز روشنی ڈالی ہے، یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے حکماء اور صوفیہ نے بھی اپنی اپنی طرز پر نئے نئے مسائل کو اپنے رنگ میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اُس وقت اور زمانے کے مطابق تھا اور آج وقت کا تقاضا کچھ اور ہے اور قرآن حکیم کی متشابہہ آیات پر نئی روشنی ڈالی جا رہی ہے اور وہ محکمات بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اس بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے برگسان، نیوٹن، آئنسٹائین، ڈارون اور ہالڈین پر وسیع نگاہ ڈالی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان حکماء کے فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اس لئے علامہ کی ایک حیثیت تو ایسی نظر آتی ہے جس کا مثیل ملنا مشکل ہے اور دوسرے انہوں نے موازنہ جو کیا تو وہ ان کے سوا اور دوسرا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ موازنہ کے بغیر علامہ کے خیالات اُبھر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ جن جن مسائل نے خود علامہ کے زمانے میں مسلمانوں پر غیر متوقع اثرات ڈالے تھے علامہ نے ان پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ مثلاً مسئلہ ختمِ نبوّت اور آمد مہدیؑ اور حیات مسیحؑ پر بھی ایک گہری نظر ڈالی کیونکہ یہ مسائل خود ان کے زمانے میں مسلمانوں کے لئے ایک عظیم دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ جہاں انہوں نے قادیانیت کا بھانڈا پھوڑا وہاں انہوں نے آمد مہدی والی احادیث کی نوعیت پر بھی کلام کیا ہے اور حیاتِ مسیحؑ

پر بھی۔ وہ اپنے اشعار میں ان تمام قدیم عمارتوں کو مسمار کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ بصیرتِ قرآنی تھی۔ جس نے ان عقائد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کا ایک شعر ہے ؎

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ ۔۔۔ اب انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے! [۱]

علامہ اقبال کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ ان امور کی تصدیق قرآنی آیات سے نہیں ہوتی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان وضعی مسائل نے مسلمانوں کو کیسی غلط راہوں پر ڈال دیا ہے اور ان کے اندر کس قدر شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان عقائد کی وجہ سے قوم مفلوج ہو رہی ہے اور چونکہ اقبال قرآن کی عملی تفسیر کے قائل تھے۔ اسی لئے وہ ایسے مسائل کو خارج از قرآن سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان مسائل کا تعلق زیادہ تر ہندوستان

---

[۱] بے شک یہ شعر علامہ کا ہے۔ لیکن انہوں نے بانگ درا کی اشاعت کے وقت جہاں اور بہت سا اپنا پرانا کلام خارج کر دیا تھا، اس کو بھی قابل اشاعت نہیں سمجھتا تھا۔ اس ردیف "تکلیف" کی بارہ اشعار کی غزل تو موجود ہے لیکن اس میں یہ شعر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس موضوع پر کوئی سنجیدہ مضمون نہیں لکھا۔ باقی رہی انکار کی بات تو اس پر پہلے سرسیدؒ اپنی تفسیر میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں جس کو جمہور امت نے قبول نہیں کیا تھا۔ البتہ قادیانی مدعی نے سرسیدؒ کی نذر ربائی اپنے مخصوص مقصد کے لئے کی۔ سرسیدؒ کی نیت اور قادیانی کی نیت میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ جس کو سب لوگ جانتے ہیں۔ اس موقع پر علامہ ہی کا ایک شعر سامنے آ گیا، وہ بھی سن لیجئے! ؎

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار ۔۔۔ نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

(ضربِ کلیم)

کے مسلمانوں سے ہے - بیرونی ممالک میں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی [1]

مسلمانانِ ہند کے قلب زیادہ تر علماء کی منطق کے رُعب سے دبے ہوئے تھے ۔ جنہوں نے ان مسائل کو سیاسی رنگ میں ان پر مھوٹنس دیا تھا - اقبال ان سیاسی مصلحتوں کو بھی سمجھتے تھے اور اس منطق کو بھی - اس لئے انہوں نے اس طلسم کو طشت از بام کر دیا اور قرآن اور حدیث کی نئی تفسیر پیش کی - آمد مہدی کی طرف انہوں نے اپنے انگریزی کے بیانات میں بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ ایک مجوسی عقیدہ ہے -

یوں تو علامہ کے سینکڑوں اشعار میں آیات کے ٹکڑے آ گئے ہیں جن میں ان آیات کی تشریح کر دی گئی ہے اور بعض جگہ ایک ایک آیت کے ٹکڑے کے لئے کئی کئی اشعار آئے ہیں - ان سب کا یہاں درج کرنا موجب طوالت ہو گا - مختصر یہ کہ علامہ کے اشعار میں ان آیات کی تفسیر آ گئی ہے - صرف ایک مقام پر علامہ نے ایک پوری سورۃ کی تفسیر لکھی اور وہ ہے سورۂ اخلاص جس کی تفسیر ہم کو اسرارِ خودی میں ملی ہے اس کے سوا اور کسی مکمل سورۃ کی تفسیر علامہ کے اشعار میں نہیں آئی اور مکمل سورت کا آجانا ضروری بھی نہ تھا - صرف سورتوں اور آیات کے ان اہم حصّوں کو علامہ نے لکھا ہے جن سے اصل مقصد حل ہو جاتا ہے - اگر اس معیار کو سامنے رکھ کر علامہ نے پورے قرآن کی تفسیر کر دی ہوتی تو اس کی اہمیت میں

---

[1] یہ بات سچ ہے علامہ ایسے غیر عملی مسائل میں اُلجھنا اور مسلمانوں کو اُلجھائے رکھنا ابلیسی چال سمجھتے تھے ، جیسا کہ اپنی آخری تصنیف " ارمغانِ حجاز " کے حصّہ اردو میں انہوں نے " ابلیس کی مجلس شوریٰ " کے عنوان سے مفصل لکھا ہے

کس کو شک ہو سکتا تھا۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی نہ تھی جو جو اہم نکات تقاضائے زمانہ تھے علامہ نے ان کو ایک ایک کر کے اُجاگر کر دیا ہے، قوم اُن پر عمل کر کے اپنے آپ کو سدھار سکتی ہے اور مزید تنزّل سے بچا سکتی ہے اور اسلامی فکر کو بھی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ علامہ کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ جدید فکر بہت آگے نکل گئی ہے جس سے مسلمان آشنا نہیں۔ اگرچہ ان کی طرف قرآن حکیم اشارہ بھی کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر تخلیقی ارتقاء کا مسئلہ ہے CREATIVE علامہ نے برگساں کا بدرجہ غایت مطالعہ کیا تھا اور اس نظریئے (تخلیقی ارتقا) کو نہ صرف قرآن میں تلاش کیا بلکہ مسلمان مفکرّین کے کلام سے بھی اخذ کیا۔ چنانچہ "کُن فَیَکُوْن" کی تفسیر میں وہ ایک بڑا ہی عمدہ شعر لکھتے ہیں جس میں یہ تمام جدید فکر تخلیقی ارتقاء کا آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؏

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید  کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون!

بظاہر یہ شعر کُن فیکون ہی کی تفسیر معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ آیت کُلَّ یومٍ ھو فی شانٍ[1] کی تفسیر ہے اور اس میں تجدّدِ امثال کی طرف اشارہ ہے۔ تجدّدِ امثال RENEWAL OF FORMS ایک جدید فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کا ذکر نہ صرف قرآن میں آ گیا ہے بلکہ مسلمان مفکرین بھی اس پر کلام کر چکے ہیں۔ مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل فرماتے ہیں۔ ؏

بہ ہر لحظہ بہر ساعت بہ ہر دم  دگر گوں می شود احوال عالم

---

[1] وہ (خدا) ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔ (ترجمہ تھانویؒ) (الرحمٰن ع ۲)

(اقبال ......)

کائنات کے اندر نئی نئی نوعیں وجود میں آرہی ہیں ان میں تکرار نہیں ہے - یہ بات بڑے پتے کی ہے، کیونکہ تکرار میں کوئی کمال نہیں ہوتا - اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے اندر تنوّع ہے تکرار نہیں ہے - یہی اس کی خالقیت کا کمال ہے - جدید مغربی فلسفہ تکرار کا قائل ہے اور اقبال ان کو انہ روئے قرآن بتا رہا ہے کہ یہ غلط ہے !!!

اس مختصر سے مقالے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ علامہ کے تمام ایسے اشعار کو پیش کیا جا سکے - ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ صرف چند ایک اشعار پر اکتفا کیا جائے گا - علامہ کے اردو اور فارسی اشعار میں سینکڑوں آیات کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں جو نئی نئی تفسیر کی جھلک دکھا رہے ہیں - انہی پر غور کرنے سے انسان کے سامنے ایک نیا جہاں کھل سکتا ہے - کلمہ طیبہ ہی کو لیجئے، علامہ نے کئی انداز سے اس پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے معانی کو واضح کیا ہے ہم ایک اور شعر یہاں لکھتے ہیں - ملاحظہ فرمائیے علامہ نے کیا بات پیدا کر دی ہے۔

لا الہ گوئی بگو از روئے جان — تا نہ اندام تو آید بوئے جان

قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ — ہیبتِ مرد فقیر از لا الٰہ !

مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی ہر تعلیم کا علامہ نے ایک عملی پہلو نکالا ہے جس سے مسلمان اپنی شخصیت کو استوار کر سکتا ہے اور یہ تعمیر خودی کا ایک ایسا پہلو ہے جس پر نہ صرف مسلمان کی زندگی کا دار و مدار ہے بلکہ تمام قوم اس سے سدھر سکتی ہے، انسان کو سدھارنے کے لئے قرآنِ حکیم اللہ میاں کا ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور چونکہ انسان اور قرآن دونوں لازم و ملزوم ہیں ایک کو دوسرے سے الگ نہیں

کیا جا سکتا۔ ؎

صد جہاں باقیست در قرآن ہنوز  اندر آیاتش یکے خود را بسوز

اس ایک شعر میں قرآنی خوبیوں کا کس قدر مکمل احساس و شعور موجود ہے۔ گویا صاف صاف کہہ دیا ہے کہ قرآن کے بغیر تمہارے امراض کا اور کوئی علاج ہی نہیں ہے، اس لئے اس میں غوطہ زن ہو جاؤ۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو قرآن کے مندرجات کا مکمل فہم و تدبّر اور شعور ہو۔

آخر میں ہم دو ایک مثالوں سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال کی دُور رس نگاہ قرآنی بصیرت کا ایک جامع مرقّع ہے سنیئے اور سر دُھنیئے!

ینسلون کے معانی سمجھانے کے لئے وہ کس طرح اس کو اشعار کا لبادہ پہناتے ہیں اور حقیقت کو عیاں کرتے ہیں ؎

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے  دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز  ٹل نہیں سکتا وقد کنتم بہ تستعجلون [1]
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام  چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون [2]

---

[1] جرائم پیشہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر عذاب کا وعدہ سچا ہے تو دیر کیوں لگ رہی ہے؟ پھر جب عذاب آ ہی جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے۔ الآن وقد کنتم بہ تستعجلون (یونس ع ۵) ہاں اب مانا حالانکہ (پہلے سے) تم (بقصد تکذیب) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے (ترجمہ تھانوی)

[2] حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون (انبیاء ع ۷) یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جاویں گے اور وہ غایت کثرت کی وجہ سے) ہر بلندی سے (جیسے پہاڑی اور ٹیلہ) نکلتے (معلوم) ہوں گے۔ (ایضاً)

پھر دیکھئے کہ اس دور کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے؟ یہ ہے سرمایہ داری اور مزدوری، اس میں ہماری حکومت بھی آج کل الجھی ہوئی ہے اور نت نئے خیالات کا اظہار مختلف الخیال لوگ کر رہے ہیں۔ مگر علامہ نے آج سے نصف صدی پہلے بانگِ درا میں یہ کہہ دیا تھا ع

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکردہ کار! عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لیس للانسانِ الا ما سعیٰ[1] کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار!!

---

[1] انسان کو صرف اپنی کمائی ہی ملے گی۔ نجم۔

(علامہ اقبال....)

رشید شیدائی

# عورت کا صحیح مقام اقبالؒ کی نظر میں

حضرت آدمؑ کے لئے بہشت کی رنگینیاں عورت کے بغیر بے کار تھیں۔ خُلد کی آسائشوں میں بھی انہیں جس رفیق کی تمنّا نے بے تاب رکھا۔ وہ حوّا تھی پھر آدمؑ کو کائنات ارضی پر لانے کی ذمہ داری بھی عورت پر ہے۔ اگر عورت کی تخلیق نہ ہوتی تو حضرتِ آدمؑ خُلد میں جمود و خمود کی زندگی گزار دیتے، اس دنیائے ارضی پر لانے والی ہستی کی اہمیّت کو فراموش کر دینا حقائق کو پسِ پشت ڈالنا ہے۔ عورت رباب حیات کا شیریں نغمہ ہے وہ تصویرِ کائنات کی رنگینی کا سامان ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

تاریخ کے رجالِ عظیم، قومی رہنماؤں، بڑے مفکّروں نے اپنی ماؤں کی گود میں وہ تربیت حاصل کی جس نے ان کی عظیم الشان شخصیت کو ڈھالا، انہیں اپنے

بزرگوں کے کارنامے، قومی غیرت کے قصّے، ملّی شجاعت کی داستانیں، قربانی اور ایثار کی مثالیں بچپن میں اس انداز سے سُنائیں کہ آج اُن کا نام لیتے ہوئے ہماری گردنیں فرطِ عقیدت سے جُھک جاتی ہے۔ کربلا کے میدان میں دادِ شجاعت اور مردانگی دینے والے فرزندگانِ اسلام کے نیک جذبہ کی بنیاد عورت کے مقدّس ہاتھوں سے پڑی۔ کم سن اور جوان ہمّت عون رضؓ و محمد رضؓ کو ہتھیار سجانے والی نیک خاتون بی بی زینب کا نام دینا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ عورت قوم کی بلندی و پستی، قوّت و کمزوری۔ ترقی و تنزّل۔ بالغ نظری اور کوتاہ بینی کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ کسی قوم کے ارتقا اور انحطاط کا راز اس کی عورت کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

اقبالؒ مخدراتِ اسلام کو جنابِ بتولؓ کا اسوۂ کامل پیش کرتا ہے۔ ع

مادراں را اسوۂ کامل بتول

وہ عورت کو مغرب پرستی کا درس نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام کے اس زرّیں دَور کی طرف بُلاتا ہے۔ جو تاریخ میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا اور جس سے ہمارا نہیں بلکہ دنیا بھر کا مستقبل منوّر ہو سکتا ہے۔ وہ عورت کو اس بتولؓ کے مکتبِ حیات میں لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں وہ نیک بی بی، ع

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

نظر آتی ہیں۔ اقبالؒ کو موجودہ زمانے کا ضمیرِ بے حجابی پسند نہیں، وہ عورت سے کہتا ہے کہ دنیا میں اُجالا کرنے کا کام تو خدا سے سیکھ جو خود پردے میں ہے۔ لیکن اُس کے نور سے دنیا جگمگا رہی ہے۔ تو وہ بہار بن کر خود اوجھل ہے۔ مگر اُس سے دنیائے رنگ و بُو مہک رہی ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک

ہر تخلیق کی پاکیزگی کا راز اس میں ہے کہ خالق پردے میں ہو۔ مصنف کی بہترین تصنیف وہ ہے جسے وہ تخلیہ میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ دنیائے ادب میں ممتاز درجہ جیسیات کو حاصل ہے جو تنگ و تاریک جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر مصنّف لکھتا ہے۔ شاعر جو اپنی دنیا کا خالق ہے موزونیٔ شعرِ سخن کے لئے تخلیہ چاہتا ہے یا کم از کم خلوت در انجمن ہوتا ہے۔ گویا تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ خالق پردے میں ہو تاکہ اس کے محاسن میں اضافہ ہو ؎

اگر پندے نہ درویشے پزیری
ہزار امّت بمیرد تو نہ میری

بتولے رضؓ شو و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے رضؓ بگیری

اقبالؔ جسے قوم کی تباہی رُلاتی ہے جس کی راتوں کی نیندیں اُمّت کی بدحالی دیکھ کر اُچاٹ ہیں۔ اس کی آخری اُمید مادرانِ قوم سے وابستہ ہے۔ اور قوم کی شوکتِ محل اس کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ بچّہ کو اسلام کا بنیادی اصولِ اوّل ماں ہی سکھاتی ہے ؎

کودکِ ما چوں لبِ از شیرِ تو شست
لا الٰہ آموختی اُو را بخست

اقبالؔ رح ذو فنونی اور عیّاری کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اُسے نظر آرہا ہے کہ زمانے میں نیک و بد کی تمیز نہیں رہی۔ بے حیائی حد سے بڑھ گئی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کش مکش کے دَور میں شیرازۂ قومی کو بکھرنے سے عورت

ہی بچا سکتی ہے ۔ وہ قوم کی خاتون سے یُوں خطاب کرتا ہے ۔

دیکھ زمانے کی دست بُرد سے قوم کو محفوظ کرلے اپنے بچّوں کو کنارِ عاطفت میں لے لے ۔ یہ بچّے جنہوں نے اُڑنے کے لئے ابھی پَر نہیں تولے اور تباہی کے اُٹھتے ہوئے طوفان نظر آرہے ہیں ۔ یہ تیری تربیت کے محتاج ہیں ۔ تیرے لئے اسوۂ جناب بتولؓ کی ذات گرامی ہے ۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تو اُن کے اسوۂ حسنہ پر چل پڑے تو تیری خاکستر میں ایمان کی وہ چنگاری موجود ہے جس سے قوم میں اب حسینؓ پیدا ہو سکتے ہیں ۔

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بہ گل زار آورد

اقبالؒ کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ان کے مخصوص دائرہ فکر کی تعمیر میں ان کی والدہ کا ہاتھ ہے ۔ اسلامی جذبہ و حمیت اور قومی غیرت انہوں نے اپنی والدہ کے کنارِ عاطفت میں پائی ۔ مکتب و مدرسہ میں انسان کچھ نہیں سیکھتا اصل تعلیم گاہ اس کے اپنے گھر کا ماحول ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ تعمیرِ انسانیت میں علم کو بڑا دخل ہے ۔ مگر اس بارشِ انوار کے لئے موزوں ظرف تراشنا ماں اور صرف ماں کا کام ہے ۔ بارش کا قطرہ سیپ کے منہ میں گوہرِ آبدار اور سانپ کے مُنہ میں جا کر سمّ بن جاتا ہے ۔

اقبالؒ قوم میں ایسی مائیں دیکھنے کا آرزومند ہے جو ایسے سیپ پیدا کریں جن میں پڑ کر ہر علم کا قطرہ ایسا گوہر آب دار بنے جس کی تابانی سے ایک عالم جگمگا اُٹھے۔ اقبالؒ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ کہ میرے افکار کی شیرازہ بندی میں میری والدہ کی نگاہِ ادب آموز کارفرما ہے ؎

مراد او این خرد پرور جنونے
نگاہ مادرِ پاک اندرونے

ز مکتب چشم و دل نتوان گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

مشاہدہ شاہد ہے کہ اب شاید مولوی اور قاری کی قرآن خوانی اہلِ نظر کے دلوں کو گرمانے سے قاصر ہے۔ اقبالؒ دخترِ اسلام سے کہتا ہے کہ ہماری بے بسی کی شام کو تجھے سحر میں تبدیل کرنا ہے۔ اُٹھ اور اہلِ نظر کو قرآن سنا! تجھے معلوم ہے کہ تیری قرأت کی بدولت حضرت عمرؓ اسلام سے مشرف ہوئے ؎

ز شامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را

تو می دانی کہ سوزِ قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

حضرت بابا فرید شکر گنج کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے بچے کو کبھی بے وضو دودھ نہیں پلایا۔ جس ماں کی طہارت اور پاکیزگی کا یہ عالم تھا اس کی آغوش سے جو بچہ تربیت پا کر نکلا وہ اس عظیم الشان شخصیت کا

مالک ہوا جسے بابا فرید شکر گنج کے نام سے آج تک دنیا ادب سے یاد کرتی ہے۔
ایسی مائیں اقبالؒ کے نزدیک جناب بتولؓ کا فیضان ہیں۔ جن کے حضور میں
اقبالؒ خراجِ عقیدت ادا کرنے کو بے تاب نظر آتا ہے لیکن جنابِ مصطفیٰ صلی اللہ
علیہ وسلم کا دستِ غیب اسے روک دیتا ہے۔ ؎

رشتۂ آئینِ حق زنجیر پاست
پاسِ ناموسِ جنابِ مصطفیٰ است

ورنہ گردِ تربتے گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

اسلام کے ابتدائی زمانے میں عورتوں نے حیرت انگیز کارنامے سرانجام
دیئے ہیں۔ جہاد میں وہ مردوں کے دوش بدوش لڑیں۔ مرہم پٹی۔ سقائی۔
زخم خوانی اور جوانوں میں غیرت آفرینی اُن کا کام تھا۔ یہ رجز مہادروں کے
دلوں میں عزم آہنی پیدا کرتے تھے۔ اور جوشِ شہادت سے سرشار اور دنیا و ما
فیہا سے بے نیاز بنا کر لڑا دیتے تھے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایک
خاتون فاطمہ نامی جن کا نام اقبالؒ بڑے **ادب** سے لیتا ہے۔ جنگ طرابلس
میں پانی پلاتی ہوئی شہید ہو جاتی ہیں۔ ؎

فاطمہ تو آبروئے امّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تیری قسمت میں تھی

'یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر'
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

مغلوں کے انحطاط کے زمانے میں بھی ایک خاتون شرف النسا جو لاہور کے ایک گورنر کی دختر تھیں۔ روحِ اسلامی کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس پاک خاتون نے شادی نہیں کی۔ ایک تلوار اُن کی کمر سے لٹکی رہتی تھی۔ اور قرآن سامنے دھرا رہتا تھا اور ع

از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

اس کا اعتقاد تھا کہ تلوار اور قرآن ایک دوسرے کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور — اند

جب وقتِ آخر آیا تو اس خاتون نے والدہ سے فرمائش کی۔ کہ میری تلوار اور قرآن ہمیشہ موجود رہیں۔ گنبد اور قندیل اگر نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں مدت تک یہ مزار شمعِ ہدایت کا کام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی بدعنوانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھوں نے طاقت پکڑ ی اور جہاں اور مقدس عمارات

کی بے حرمتی ہوئی وہاں شرف النساء کا مزار بھی شمشیر اور قرآن سے محروم کر دیا گیا۔ اقبالؒ کے خیال میں پنجاب میں اسلام کا جنازہ اُٹھ گیا۔ ؎

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندریں کشور مسلمانی بمرد

آج شرفِ انسانیت کی تکریم۔ روحِ اسلامی کی بقاء و امّت مرحومہ کے ارتقاء کی خواہش مند اقبالؒ کی روح ایسی مادرانِ ملّت دیکھنے کی آرزومند ہے جو ہمارے درخشاں ماضی کی طرح ہمارے مستقبل کو منوّر کر دیں۔

مولانا صلاح الدین احمد

# اقبال اور حُسنِ معاشرت

اقبال کی شاعری کو حسنِ انسانی اور حسنِ فطرت کے بعد جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حسنِ معاشرت کا ایک بلند پایہ اور مثالی تصوّر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شعرِ اقبال میں ترتیب کے لحاظ سے اس کی نمود آخر میں ہوئی ۔ لیکن آغاز کے بعد اس کا فروغ وسعت اور شدّت دونوں کے اعتبار سے شاعرِ مشرق کے کلام میں ایک بے مثال حیثیت رکھتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اس کو قومی اور ملّی شاعری کے تمام دوسرے گوشے میں چھُپا لیتا ہے ۔

اقبال کی شاعری کی جس ممتاز خصوصیت کا سب سے زیادہ چرچا ہے ۔ اور جو شہرت کے پروں پر ہند سے عجم اور عجم سے فرنگ تک جا پہنچی ہے وہ مسلّمہ طور پر اس کی تعبیرِ خودی ہے ۔ لیکن غور کیجئے تو شاعر کا یہ محبوب نظریہ جسے وہ کبھی فرد کے ارتقائے رُوحانی کی بنیاد اور کبھی اقوام کے عروج و زوال کا محور قرار دیتا ہے ۔ اس

کے تصوّرِ معاشرت ہی کا ایک جمیل اور مثبت پہلو ہے ۔خواہ یہ معاشرت انفرادی ہو یا اجتماعی ، قومی ہو یا ملّی ۔ جوارِ کعبہ میں فروغ پائے یا بُت کدۂ ہند میں لیکن اس نقطے کی طرف ہم آگے چل کر لوٹیں گے۔ یہاں مجھے فقط اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ شعرِ اقبال میں حسنِ معاشرت کی تفسیر کو نہ صرف ایک گراں قدر اہمیّت حاصل ہے بلکہ آخر میں یہی ایک موضوع اس کی شاعری پر سربسر چھا جاتا ہے اور شاعر کے نطق سے لے کر اس کی الہامی کیفیات جذب و فکر تک سب پر محیط ہو جاتا ہے ۔

اقبال کے طالب علموں اور اس کے ناقدوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ اس کی شاعری کے دورِ اول ہی میں حسنِ معاشرت کے متعلق اس کے تصوّرات کی تشکیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ اقبال کے ہاں گل و رخسار کی شاعری کا عنصر ویسے ہی بہت کم ہے ۔لیکن جب شاعر اپنے شباب ہی میں اس کوچے سے نکل کر فطرت کے پُر بہار چمنستان میں چہل قدمی کر چکا اور ہمالہ سی عظیم المرتبت نظمیں بھی اس کے خامۂ گل ریز کی تراوش سے حیاتِ جاوداں پا چکیں ۔ اور تصویرِ درد کی سی زندہ جاوید نظم میں وہ حبِ وطن کے زمزموں سے اہلِ وطن کے دلوں کو گرما چکا ۔ تو اُس نے یک بیک اپنے آپ کو اس وادی میں پایا جس کے ایک طرف سینا و فاران کی چوٹیاں اور دوسری جانب زندگی کا یم بے کراں اور اس کے عین درمیان ایک بے سروپا قافلہ جو سالارِ وحدی خواں کے بغیر اپنا راستہ ٹٹولتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ اور وہ بے اختیار پکار اُٹھا ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

---

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلۂ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر وہ دریا سے پار ہو گا

---

نکل کے صحرا سے جس نے رُومہ کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

---

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی ۔ مگر نیا خارزار ہو گا

---

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

میری ناچیز رائے میں اقبال کی یہ معرکہ آرا نظم جو اس کے قیام فرنگ کے دوران میں لکھی گئی تھی ۔ اس کی شاعری کی شاہراہ پر ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کی دوسری خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اس کے اس امتیاز کو آپ کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتا ہوں کہ وہ اس کے فقط پانچ اشعار میں اپنی ملّت کے نوجوانوں کے سامنے زندگی کے پانچ نئے نصب العین پیش کرتا ہے ماحول کی تاریکی میں رہبری کا عزم، حوصلہ ۔ مخالف حالات سے ستیزہ کاری و نبرد آزمائی، روایات سلف کی تجدید ۔ تہذیب و تمدّن کی فضا میں فقر کا احیا اور نفاذ اور عالم انسانیت سے ایک بے پایاں محبّت ۔ ذرا غور فرمایئے تو یہی وہ عناصر خمسہ ہیں جو

آگے چل کر اس کی شاعری میں کہیں خودی کا فلسفہ بن کر رہنما ہوئے۔ کہیں مومن کی شان میں جلوہ آرا نظر آئے کہیں شاہیں کی پرواز فلک سیر میں دکھائی دیئے اور کہیں فقر کی سریر آرائیوں اور محبت کی فتح مندیوں میں نگاہوں کو خیرگی عطا کرتے چلے گئے۔

اقبال کا کاروانِ سخن یہاں سے روانہ ہو کر اپنے سفر کی اولیں منزل میں متعدد مقامات پر ٹھہرتا ہے۔ لیکن ہر مقام پہلے مقام سے شاداب تر اور بلند تر ہے اور قطع سفر کے ساتھ ساتھ شاعر کا لہجہ ایک قطعیت۔ ایک راستی اور ایک دلکش وضاحت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اب وہ قوم کے نوجوانوں سے اشارات و کنایات میں بات نہیں کرتا۔ بلکہ حالات کے تقاضے سے متاثر ہو کر براہِ راست خطاب کرتا ہے۔ اس کے ضمیر پر یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ قوم کا مستقبل اس کی نوجوان نسل کے ہاتھ میں ہے اور اس نسل کی بقا اس کی سخت کوشی اور غیرت مندی ہی پر منحصر ہے اور جادۂ حیات پر اس کی راست روی شمع رسالت ہی کی ضو پاشیوں کی محتاج ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمہ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

کشاکش دم وگرما تپ وتراش وخراش
زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقام بست وشکست وفشار وسوز وکشید
میانِ قطرۂ نیسان وآتشِ علبی
اِسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب وتابِ ملّتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب مے سازند
ستارہ مے شکنند آفتاب مے سازند

نوجوانوں کو مشکل کشی اور جفاطلبی اور بست وشکست اور سوز وفشار میں زندگی کی یافت کا راستہ دکھاتے ہوئے وہ ذرا اور آگے بڑھتے ہیں اور ماضی کے دھندلکوں میں سے اُن کو تب وتابِ ملّتِ عربی کا ایک منظر یوں دکھاتے ہیں ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا
تمدّن آفریں خلّاقِ آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیّارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی۔ کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

---

حکیم اُمّت نے اس تعلّم میں اُمّت کے اسبابِ زوال میں سے ایک اہم سبب نوجوانوں کی اس غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ روش زندگی کو بتایا ہے

جس کی بدولت وہ نعمتِ لازوال جو ایک عظیم الشان ورثے کی صورت میں انہیں ملی تھی۔
ان کے ہاتھوں سے چھنتی چلی جا رہی ہے اور وہ گرمیٔ عمل سے بیزار اور لذتِ گفتار
میں اسیر ہو کر بیشتر انعامِ الٰہی سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس نوع کی ایک
اور نظم میں وہ طنز کی تلخی کو شعر کی حلاوت میں ملا کر اپنے مخاطب کو جو پھر نوجوان
ہے۔ سوچنے پر یوں مجبور کرتے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

---

اسی انداز میں ایک جگہ یوں ارشاد ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفانما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کبھی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

---

اقبال کے کلام اولین یعنی بانگِ درا کی آخری نظموں اور بالِ جبریل کی ابتدا میں شاعر کے فکر کا یہ اسلوب اور اس کے تصوّرات کا یہ مرکز خاص حد تک واضح ہو گیا ہے اگر وقت ہوتا تو میں اس دور کی معروف نظموں یعنی جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام اور خضرِ راہ میں سے متعدد ایسے مقامات آپ کے سامنے پیش کرتا۔ جن سے میری اس گزارش کی تائید ہوتی۔ لیکن اختصار کی ضرورت میرا دامن کھینچ رہی ہے اور میں فقط چار اشعار اور پیش کر کے اس کی شاعری کے اگلے دور کی طرف پیش قدمی کروں گا۔ یہ اشعار اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب مسلمانانِ ہندوستان کا ایک وفد مسئلہ خلافت پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان گیا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں:۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اگرچہ بظاہر ان اشعار کا زیادہ تعلق مسلمانوں کی سیاست سے نہیں لیکن دراصل شاعر ان سے بہتر کام لے کر اس کمزوری پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جو کمی غیرت اور میلان سوال کی صورت میں اسلامیانِ ہند کے معاشرے میں پیدا ہو رہی تھی۔ آگے چل کر اس کا یہ اندازِ فکر اور اس کے مخاطبین کا محل قبول واضح تر ہو جاتا ہے اور "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کی بیشتر منظومات اس نوع کے مواقع اور خطابات سے معمور ہیں۔

میرا مقصود اس حوالے سے محض یہ جتانا ہے کہ فقر اور فقر سے پیدا ہونے والا اعتماد، ایمان سے پیدا ہونے والا اعتماد، ایمان اور ایمان سے پیدا ہونے والا ایقان یہ وہ عناصر ہیں جو شعرِ اقبال اور اس کے موضوعات میں اس وقت بھی نشوونما پا رہے تھے۔ جب کہ شاعری ابھی کاملاً ملی رنگ میں رنگی نہیں گئی تھی۔ اور سخنوری کی سطح سے اُبھر کر الہام کی رفعت سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جب شاعری کی بیشتر توجہ پہلے فرد کی سیرت تعمیر میں اور پھر اس سے بلند ہو کر قومی سیرت کی تشکیل میں صرف ہونے لگتی ہے۔ یہ اسرار و رموز کی سرحدیں ایک مثالی اسلامی معاشرت کی پہنائیوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں تو فارسی میں پیامِ مشرق اور جاوید نامہ اور اردو میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی وہ شاعری سامنے آتی ہے جس کا سب سے بڑا موضوع ملتِ اسلامیہ کی معاشرت، اس کی ممکنات اور اس کے مستقبل سے ہے۔ ان صحائف کے اوراق

ہیں آپ کو اقبال کی روداد سخن کے دو دھارے ساتھ ساتھ اسی طرح رواں نظر آئیں گے۔ گویا وہ مصفّا نہریں ہیں جو گنگا جمنا کی طرح ایک ہی پربت سے نکلتی ہیں اور پہلو بہ پہلو جاتی ہوئی ایک ہی سمندر میں جا ملیں گی۔ ایک دھارے کا نام خودی ہے اور دوسرے کا نام فقر اور ان دونوں کا امتزاج ہے۔ خودی کے دھارے میں خود شناسی اور خدا شناسی کی موجیں کروٹیں لیتی ہیں اور عرفان و ایمان کی سلسبیل دمکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ فقر کا دھارا عشق اور رحمت کی کوثر و تسنیم کو اپنے سینے سے لگائے سرودِ زندگی گاتا ہوا منزلِ ابد کی طرف رواں ہے۔ شعر اقبال کی یہ کیفیت دیدنی ہے۔ گفتنی و شنیدنی نہیں ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فقر کی بلند نگاہیوں اور بے نیازیوں کا ایک تصوّر شاعر نے شاہین کے ہیولے میں مجسّم کیا ہے اور اسے زندگی کے ایک مثالی نمونے کے طور پر ملّت کے نوجوانوں کے سامنے بار بار پیش کیا ہے ؎

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
یہ بادِ بہاری نہ گُل چیں نہ بلبل
یہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں وہ
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پھر فرمایا کہ ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے نہ نیستاں کے لئے

آفاق ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم

# نظم مسجد قرطبہ

## جو ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی

بالِ جبرئیل کا سرسری مطالعہ کرنے سے پڑھنے والے کا ذہن دو نظموں کی طرف فی الفور منتقل ہوتا ہے ۔ وہ دو نظمیں "ساقی نامہ" اور "مسجد قرطبہ" ہیں۔ جو کئی ایک اعتبار سے اقبال کی اردو نظموں میں شاہکاروں کا درجہ رکھتی ہیں ۔اور اردو ادب و شعر میں بے مثال ہیں ۔

موخر الذکر نظم میں مسجد قرطبہ کا عنوان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اقبال کے کلام میں "بلال" "کنار راوی" یا "موٹر"۔ شاعر نے اس نظم میں مسجد قرطبہ کی تاریخ بیان نہیں کی۔ اس کے فنی اور تعمیری محاسن کا جائزہ نہیں لیا ۔نظم "صقلیہ" کی طرح اس قدیم حجازی تہذیب پر آنسو نہیں بہائے ۔ یہ عنوان محض ایک مرکزی نقطہ ہے ۔ جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے ۔ایک کنایہ ایک اشارہ ہے ۔ جو اس کے شاعرانہ احساسات کی ترجمانی کا کام دے رہا ہے ۔

شاعر نے اس نظم میں بہت سے مختلف النوع اور ایک دوسرے سے متضاد عناصر کو جمع کر دیا ہے۔ مثلاً وقت کی رو، بندہ مومن، آرٹ، اندلس کی فضائے حسین، عالم نو کے معرض وجود میں آنے کے امکانات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام عناصر کو اس طرح منسلک کیا گیا ہے۔ کہ اُن میں باہمی مغائرت باقی نہیں رہتی۔ وہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ شاعر نے ان میں ایک تسلسل پیدا کیا ہے یہ تسلسل منطقی نہیں بلکہ جذباتی ہے۔ چنانچہ ساری نظم ایک مکمل جذباتی تجربہ ہے۔ جس کے خط و خال کو شاعر کے ذہن نے ایک ہی تخیل، ایک ہی جذبے کی گہرائیوں میں ڈوب کر سنوارا ہے۔ جس طرح حباب یا موج کے وجود کا الگ تصوّر آب دریا کی پنہائیوں اور گہرائیوں کے بغیر ذہن میں نہیں آتا۔ اسی طرح اس نظم کے کسی ایک بند یا ایک شعر کا تصوّر ساری نظم کے بغیر نامکمل سا رہ جاتا ہے اور کسی وسیع تر شعری پس منظر سے اکھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال کے شاعرانہ کمالات بانگِ درا میں موجود ہیں۔ اس لئے کہ اُن نظموں میں مضمون کا تنوع ہے اور خیالات اور جذبات کی رنگارنگی ہے۔ شاعر ان نظموں میں انسانی زندگی کے مختلف النوع محرکات کو اُکساتا اور بیدار کرتا ہے۔ جو اس کی بعد کی نظموں میں مفقود ہے۔ جہاں اس کی شاعری کا دائرہ محدود ہوتا چلا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر ایک نقطے پر رُک جاتا ہے۔ جسے اس کا پیام کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کی شاعری اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہو۔ وہ ذرا اس نظم کا مطالعہ کریں۔ اور دیکھیں کہ شاعر کس طرح ایک ہی مضراب سے سازِ حیات کے کتنے مختلف تاروں کو بیک وقت چھیڑتا چلا

جاتا ہے اور اگرچہ ہر چوٹ سے ایک نئی آواز لرز اٹھتی ہے۔ لیکن ان سب کا زیر و بم ایک ہی نغمے کی تعمیر کا ضروری جزو ہوتا ہے۔

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا تھا۔ کہ اقبال کی ابتدائی نظمیں اور بالِ جبریل ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ البتہ دونوں میں ابتدا اور انتہا کا فرق ہے۔ شاعر کے قول کے مطابق ؎

احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا

سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر

دونوں کی غایت ایک ہے۔ فرق نوعیت احساسات کا نہیں شدتِ احساسات کا ہے۔ نغمہ ایک ہے فرق ہے تو زیر و بم کا "شکوہ" ایک نادان بچے کا گریۂ معصوم ہے۔ اور عجز و بے چارگی کا اظہار، مسجد قرطبہ ایک کہن سال بزرگ کی فریاد ہے۔ اور جذبات کا جوش۔ ظاہر ہے۔ ایک بچے کی چیخ و پکار وہ اثر پیدا نہیں کر سکتی جو ایک بالغ انسان کی دبی ہوئی آہ اور اس کے خاموش آنسوؤں کی بے زبانی میں ہوتا ہے۔

اقبال ایک فلسفی شاعر ہے اس کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔ کہ اس نے دقیق اور خشک فلسفیانہ مسائل کو شعر بنا دیا۔ یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں اس کا پیام اور کلام دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ ایک مفکر بھی ہے اور شاعر بھی، ایک پیغامبر بھی ہے اور فنکار بھی۔ یہ دونوں خوبیاں ان کی کسی اور نظم میں بدرجہ اتم موجود نہیں۔

اس نظم کی کامیابی کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ شاعر باوجود اپنی فکر کی انتہائی بلندیوں اور عمیق نکتہ طرازیوں کے ہمارے دل و دماغ کے بہت قریب آجاتا ہے

اور ہمیں نہ صرف اپنے ذہنی تصوّرات میں شریک کر لیتا ہے۔ بلکہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار کر اپنے دلی کیفیات سے بھی متاثر کرتا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں کوئی نیا عروضی تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی شاعری کا ڈھانچہ تقریباً تمام کا تمام قدیم طرز کا ہے اُن کی نظموں کی بحریں - اُن کی اصناف، کلاسیکی انداز کا پتہ دیتی ہے۔ غزل، مثنوی، قطعہ، مسمطّات، ترکیب بند یہ سب پُرانے تیور ہیں۔ زیرِ بحث نظم ساخت کے اعتبار سے ترکیب بند ہے اور چونکہ اس کے آٹھ بند ہیں۔ اس لئے اسے ہفت بند کاشی کے مقابلے میں ہشت بند اقبال کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ اقبال اگرچہ طرحیہ کلام کہنے کا عادی نہیں تاہم اس نے فارسی اور اردو کے ہر بڑے استاد کی کسی نہ کسی مشہور زمین میں شعر ضرور کہے ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ کہ اس نظم کو لکھتے وقت محتشم کاشی کا مرثیہ اُس کے پیشِ نظر ہو۔

اقبال نے سہولت کی خاطر کہیں کہیں شعری تصرفات کئے ہیں مثلاً رُباعی میں مخصوص بحر کو چھوڑ کر سادہ بحر ہزج مسدس اختیار کر لی ہے۔ اور اس التزام کو اخیر تک قائم رکھا ہے۔ اسی طرح قافیہ اور ردیف کو ترک کر کے جو خالص ایرانی ایجاد ہے۔ عربی شاعری کے طرز پروری کو ترجیح دی ہے۔ بالِ جبرئیل کے مجموعے میں یہ شعری عمل کثرت سے نظر آتا ہے۔ مسجد قرطبہ کی ساری نظم بھی اسی التزام کے ماتحت لکھی گئی ہے۔ آٹھوں بند ایک ہی طرز کے ہیں۔ ہاں ہر بند کے بعد ٹیپ کا شعر قافیہ اور ردیف کا حامل ہے۔

شاعر نے نظم کی ابتدا یوں کی ہے ؎

سلسلۂ روز و شب نقشِ گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سانۂ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ تو منزلِ آخر فنا

نظم کے باقی بند بھی اسی طرح چلتے ہیں۔ مثلاً دوسرے بند کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اور تیسرے کا

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

علیٰ ہذا القیاس باقی بندوں کے اشعار بھی اسی ردی پر ختم ہوتے ہیں۔ ردی کے التزام کے ساتھ ساتھ شاعر نے جو بحر اس نظم کے لئے منتخب کی ہے۔ وہ اگرچہ نئی نہیں تاہم اردو شاعری کے مروّجہ اور متداول بحروں سے الگ تھلگ ضرور ہے۔ یہ انتخاب شاعر کا غیر شعوری عمل نہیں۔ بلکہ ارادی اور اختیاری تصرف ہے۔ اس لئے کہ اس بحر کی رفتار، خیالات کی ثقاہت، اور جذبات کے شدید مگر منضبط اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلات

کے ارکان میں جو باہمی توازن ہے۔ اس سے اشعار میں ایک اندرونی ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ جو قافیہ اور ردیف کے نہ ہونے کی تلافی کر رہا ہے۔ اور نظم کی مجموعی موسیقیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس پر طرّہ یہ کہ سب تصرفات ایسے سادہ اور قدرتی انداز میں کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ شاعر کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

اقبال کے مدّاحوں نے اس کے پیام کو اس کے کلام کے شعری محاسن پر مسلّط کر رکھا ہے۔ خود اس کے اپنے شعر بھی اس امر کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

؎ خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

؎ نہ زبان کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر ہیں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

لیکن شاید اقبال سے زیادہ زبان سے باخبر اردو کا اور کوئی شاعر نہیں تھا۔ اور "دلکشا صدا" کی حقیقت کو جسے عرفِ عام میں شعریت کہتے ہیں۔ وہ بخوبی جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے ایک عرصے کے بعد فارسی شاعری کو چھوڑ کر اردو میں پھر شعر کہنے شروع کئے تو اردو زبان کی کم مائگی یک لخت دور ہو گئی۔ جس کی اسے ہمیشہ شکایت رہا کرتی تھی۔ اور جس کا بہانہ کر کے وہ فارسی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا کرتا تھا اس لئے کہ شاعر کا ذہن خود کم مایہ نہیں تھا۔ اور جب یہ بات نہ ہو تو عجمی، تازی یا ہندی کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی۔

اقبال کو زبان پر کہاں تک قدرت حاصل تھی یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس کے لئے ایک مستقل شعری اور لسانی تجزیے کی ضرورت ہے۔ سرِ دست اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس نے اگرچہ قدیم فارسی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ لیکن ان کے معانی کا رجحان بالکل بدل دیا ہے۔

"مسجد قرطبہ" میں بعض ایسے عربی اردو فارسی کے ثقیل اور قدرے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جنہیں عام طور پر شاعرانہ زبان سے مغائرت ہے۔

سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
عشق ہے صبہائے خام، عشق ہے کاس الکرام

اسی طرح امیر جنود، ابن السبیل۔ بادۂ رحیق، ثغور اور تیغ اصیل ایسے الفاظ کی نشست شعروں میں اس طرح واقع ہوئی ہے۔ کہ وہ اردو زبان کے مانوس جزو

معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر نے نہ صرف انہیں فنی طور پر اپنایا ہے۔ بلکہ ان میں معنوی وسعت کے ساتھ ساتھ جذباتی وسعت بھی پیدا کی ہے۔ ان الفاظ اور تراکیب کو شعری تصوّرات بنا کر انہیں حسین بنا دیا ہے اور ان سے مترنم آوازیں پیدا کر کے اپنی نظم کے نغمے کی تعمیر کی ہے۔

اس نظم کی اہم اور نمایاں خصوصیت اس کا "مترنم پن" ہے۔ ساری نظم ایک خاموش قافلے کی طرح چلی جاتی ہے۔ جس کے ہر راہی کا قدم ایک ہی منہج پر پڑتا ہے اور جس کا ہر مسافر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ نظم میں مسلسل طور پر ایک جذباتی رفتار قائم رہتی ہے جس میں کہیں کوئی تیزی یا ہلکا پن پیدا نہیں ہوتا الفاظ کی اجنبیت یا ثقالت اس تسلسل میں حارج نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ الفاظ معنوی اشارے نہیں بلکہ احساساتی محرکات ہیں۔ جن سے جذبات خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں۔

اقبال جب اپنے غزل گو ہونے سے انکار کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ناسخ، ذوق اور داغ کی شاعری ہوتی ہے۔ جس میں محاورہ برائے محاورہ اور صنائع بدائع کے حربوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس نظم میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں ہوا۔ نظم میں کوئی لفظ، کوئی ترکیب کوئی استعارہ کوئی لہجہ ایسا نہیں۔ جس سے اس طرح کا مصنوعی کام لیا گیا ہو۔ نظم روایات کی سطح سے بلند رہتی ہے۔ شاعر نے لفظوں ترکیبوں اور بندشوں سے جذباتی پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ بہت کامیاب ہوا ہے۔

چند ایک شعر سنئے :۔

کعبۂ ارباب فن سطوت دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق ، وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خردِ راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں کہا تھا "مسجد قرطبہ" کا عنوان محض ایک کنایے کا کام دیتا ہے۔ اس لئے اس نظم کو پڑھ کر ذہن کسی اور ہی گوشے کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور مسجد فضا میں تعمیر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے ستون اور محرابیں سنگ و خشت کی نہیں۔ جس کی تعمیر انسان کے غیر فانی احساسات کی بنیادوں پر استوار ہے اور جس پر زمانے کی تیز رو غالب نہیں آسکتی۔ اسی لئے کہ

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

جسے دستبرد حوادث نہیں مٹا سکتی۔ اس لئے کہ وہ ابدی اور غیر فانی حقائق پر قائم ہے۔

؎ مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے

اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل
اس کی بنیادیں کسی خاص مقام سے وابستہ نہیں اس لئے کہ
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینیوب و نیل

اس مسجد کی چار دیواری اور صحن میں لوگ نماز کے لئے نہیں بلکہ ایک خلاق فن کی بارگاہ عظمت میں عقیدت و محبت کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ یعنی شاعر کی بارگاہ۔

امروز ۲۲ اپریل ۴۶ء

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

# اِسلامی فکر و عمل کا معمارِ نو
# اقبالؒ

عمل کی دو قسمیں ہیں - ایک وہ جس سے ہمارا خارجی عالم متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً تحصیل علم، رزق کے لئے جد و جہد۔ زراعت، تجارت، صنعت وغیرہ - دوسرا وہ جو ہماری اندرونی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً اخلاقی عیوب سے بچنے کی کوشش۔ عبادت سے تزکیۂ قلب اور پاکیزہ اخلاق سے تشکیل سیرت۔ اقبال کا مقصد ہے کہ انسان عالم فطرت اور دنیائے دل دونوں کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالے۔ خارجی عالم کو بزورِ علم و عقل مسخر کرے اور من کی دنیا میں عشق و ایمان کے چراغ جلائے۔ جب تک عمل کے یہ دونوں پہلو پیشِ نظر نہ ہوں شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ زندگی کو دوام حاصل ہو سکتا ہے۔

تاریخ ایسی اقوام کے ذکر سے لبریز ہے جن کی مادی شان و شوکت سے دنیا لرزتی تھی - ان کی عالیشان عمارات، محلات، باغات، سج دھج کو دیکھ کر لوگ

حیرت میں کھو جاتے تھے ۔ لیکن بایں ہمہ گردش ایام نے ان کو پیس کر رکھ دیا۔
کیوں ؟ وجہ ایک ہی تھی ۔ کہ ان کی تمام تر توجہ بیرونی دنیا کی طرف ہو چکی تھی اور وہ روح کی ضروریات سے غافل ہو گئے تھے۔

اقبالؒ کا مشہور شعر: شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر اسی حقیقت کا ترجمان ہے ۔

نیکی خارجی طور پر کوئی وجود نہیں رکھتی ۔ بلکہ یہ عمل کا نام ہے جو فکر سے عادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ مادہ محدود ہے اور اس کے لئے ہم جس قدر کوشش کرتے ہیں ۔ اس کی بھی ایک حد مقرر ہے ۔ لیکن فضائے روح لامحدود ہے دنیائے دل کے مسافر کی کوئی منزل نہیں ۔ اور ہم کسی نقطہ پر پہنچ کر یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے ، کہ بس یہاں ٹھہر جانا چاہیئے ۔ جس طرح ماہِ نو میں مہِ کامل بننے اور کلی میں چمن بننے کی صلاحیتیں نہاں ہوتی ہیں ۔ اسی طرح اس مشت خاک میں آقائے افلاک بننے کے امکانات مضمر ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ قدم رکنے نہ پائیں ۔

ساحل افتادہ را موج سبک سیر گفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم (اقبالؔ)

(سبک رفتار لہر نے ساحل سے کہا کہ چلتی رہوں تو زندہ رہوں اور رُک جاؤں تو ختم ہو جاتی ہوں)

اگر ہم اعمال کی تہہ کو ٹٹول لیں ، تو وہاں جذبات کے دھارے اُبلتے نظر آئیں گے یہی جذبات تخلیق مقاصد پر اُکساتے اور تکمیل انسانیت کی راہ ہموار کرتے ہیں ۔ بزم زندگی کی رونق انہی سے ہے ۔ اور یہی وہ روشنی ہے لیکن اس کی بہ حیثیت چراغ

راہ گزر سے زیادہ نہیں جو آس پاس کی چند قدم زمین کو تو روشن کر سکتا ہے ۔ لیکن ان ہنگاموں سے بے خبر رہتا ہے جو ذرا آگے رُوح کی دنیا میں برپا ہوتے ہیں۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغ رہگذر ہے

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

یا

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ان اشعار سے یہ غلطی نہ ہو جائے کہ اقبالؔ عقل کو بے کار سمجھتا تھا۔ یہ بات نہیں ۔ بلکہ وہ عقل و عشق ہر دو کے الگ الگ دائرہ کار متعین کرتا ہے ۔ عقل کا تعلق مادیات سے ہے اور عشق کا واردات دل اور ماورأ الطبعیات سے ۔ عقل مادی اشیاء کو بناتی ۔ بگاڑتی اور تربیت دیتی ہے ۔ عشق داخلی انسان کی آرائش و تزئین کا سامان بہم پہنچاتا ہے ۔ کہیں عشق عقل کی مدد لیتا ہے اور کہیں عقل عشق کی جہاں کہیں عقل عشق کو اپنا استاد نہیں بناتی ٹھوکریں کھانے لگتی ہے ۔

ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو یہ ورسم کار سازی

عشق کی مدد کے بغیر عقل زندگی کی جو تصویر بھی تیار کرے گی ۔ وہ بت کدہ کی مورتیوں کی طرح رُوح سے خالی ہو گی ۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عقل نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہ تصورات

عقل میں ایک خامی ہے کہ وہ نارِ نمرود میں نہیں کود سکتی ۔ یہ جرأت رندانہ صرف عشق کا حصہ ہے ۔ عقل فکر پیش و کم میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے ۔ اور عشق ایک جست میں ان جہانوں کو پا لیتا ہے جو ستاروں سے آگے آباد ہیں ۔ عقل زندگی کے جس چاک کو نہیں سی سکتی عشق اسے تار و سوزن کے بغیر سی لیتا ہے ۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار و رفو

عشق زندگی کا حسن ہے ۔ اس حسن میں اضافہ کی صورت اقبال کے ہاں ایک ہے کہ خودی خدا سے رابطہ قائم کرے ۔ خدا تمام رعنائیوں اور توانائیوں کا سرچشمہ ہے ۔ اور اس سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد انسان بھی رعنا و توانا بن جاتا ہے ۔ اقبال کا پیغام بڑا عظیم ہے اور اس کی عظمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو جلال و جمال کے درس دیتا ہے ۔ خدا ابدی و غیر فانی ہے ۔ اس سے تعلق قائم کرنے کے بعد انسان بھی ابدی و لازوال بن جاتا ہے ۔ یوں کہیئے خدا سے خودی بے حجاب ہوتی ہے ۔ اور خودی سے خدا ۔

انہ ہمہ کس کنارہ گیر، صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

(دنیا سے کنارہ کش ہو کر دوست کی صحبت اختیار کر ۔ پھر خدا سے خودی مانگ اور خودی سے خدا)

عشق و عقل کے اُلجھے ہوئے مسئلے کو جس طرح اقبال نے سلجھایا ہے وہ کسی اور

فلسفی سے آج تک نہ ہو سکا - اس موضوع کے علاوہ اقبال نے بیسیوں دیگر مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے - ہر جگہ ہمیں نئی فکر دی ہے - ہمارے اسپ ہمت کو تازیانہ لگایا ہے اور راہی کو منزل کا پتہ بتایا ہے - اقبالؒ کے خاص موضوع یہ تھے :-

خودی - عالم فطرت - انسان کامل - فرد و جماعت کا ربط - نظام معیشت - تقدیر - سلطنت - خودنگری - واردات دل - آہ سحرگاہی وغیرہ - اس مختصر سی صحبت میں ان تمام مسائل پر بحث ممکن نہیں اس لئے صرف ایک اور مسئلے یعنی سیاست پر چند ارشادات پیش کرتا ہوں -

عصر حاضر میں سیاست کو مذہب سے جدا کر دیا گیا ہے - اور یہ وہ خطرناک اقدام ہے - جس نے اقوام کی اخلاقی اقدار کو بڑی ضرب لگائی ہے قول و پیمان پر کوئی اعتماد نہیں رہا - پست اغراض شکم اور چند کم مایہ فوائد کی خاطر کروڑوں انسانوں کو ذبح کر دیا جاتا ہے اور قاتل کے دل میں ذرا سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوتی - سازش - فریب جھوٹ نفاق وہ عناصر ہیں جن سے سیاست حاضرہ کی ترکیب ہوئی ہے - ضرورت ہے کہ سیاست کے ہیمانہ تصور کی بیخ کنی کی جائے - یہ کام مذہب کے سوا اور کون سرانجام دے سکتا تھا - چنانچہ اقبال نے لادینی سیاست کو چنگیزی کہا اور دنیا کو آواز دی - کہ آؤ آؤ - مذہب کو مشعلِ راہ بنا کر سیاست کی بنیاد عدل و احسان پر ڈالو - اسلام نے دنیائے فکر و عمل میں بڑے بڑے انقلاب اٹھائے - ان میں سے ایک یہ کہ فقر و شاہی کو ہم کر دیا کراری و بوتراپی کی حدیں ملا دیں اور جمال کو جلال کا ایک پہلو قرار دیا -

انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے - اسے روح و مادہ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا - ہم اپنے تمام دینوی معاملات میں دل سے مشورہ لیتے اور ان اقدار کا احترام کرتے

ہیں جن کا سرچشمہ دل یا روح ہے۔ اگر ان اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے تو سارا ماحول گدلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ فکر رہنمائی کر سکتی ہے اور نہ عمل میں افادیت باقی رہتی ہے۔ حالات غیر متوازن ہو جاتے ہیں اور فضا مسموم۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی جسم تہذیب کی نابصیری

عالمِ انسان کا بھلا اسی میں ہے کہ دین و دنیا اور مذہب و سیاست ساتھ ساتھ رہیں۔ فقر و سلطنت ہم رکاب ہوں۔ ایسا مثالی نظام فکر و عمل جنیدی اور بشیری کے امتزاج ہی سے قائم ہو سکتا ہے یہ بات نہ ہو تو پھر سیاست کو ایک دیو بے زنجیر سمجھئے کہ جدھر کا رُخ کرے گی تباہی کا عالم نظر آئے گا۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیز راہزن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

ماحصل یہ کہ اقبال نے عشق، عقل، موت و حیات، خدا و روح، جلال اور جمال اور بیسیوں دیگر مسائل پر وہ جاندار تصورات پیش کئے ہیں۔ جو ہمیشہ زندہ رہیں گے اور جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا۔ حیات اس کے فلسفہ سے بصیرت افروز ہو گی۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ

# سودیشی تحریک اور رہبران اسلام

## علامہ اقبال کا ایک نایاب مضمون

۱- سودیشی تحریک ہندوستان کے لئے کیا ہر ملک کے لئے جس کے اقتصادی اور سیاسی حالات ہندوستان کی طرح ہوں مفید ہے کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں ہمارے اہل الرائے "سیاسی آزادی" سیاسی آزادی" پکار رہے ہیں مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی کے شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے۔ جہاں تک کہ اس کا جغرافیائی مقام اور دیگر قدرتی اسباب اس کے ممد ہوں، سیاسی آزادی کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ بغیر دام دیئے مل جائے۔ انگلستان کی سرزمین کے ہر ذرہ میں ان لوگوں کا خون چمکتا ہوا نظر آتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ باغیوں کی طرح نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرح جن کے دلوں میں اپنے وطن کے قانون

اوراس کے رسوم کی عزت ہوتی ہے اور جو اپنے گراں قدر خون کے قطرے قانون کی تائید
میں بہاتے ہیں نہ اس کی تردید اور مخالفت میں میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو قوم خود آزادی
کی دلدادہ ہو وہ اور ان کی آزادی کو رشک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے اور انگریزوں کی
معاشرت دیکھ کر بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ہاں ہم لوگوں میں اس کی
قابلیت ہونا ضروری ہے اور اس قابلیت کے پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب جیسا
کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اقتصادی قوانین کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے جس کی طرف
خوش قسمتی سے اب اہلِ وطن کی توجہ ہوئی ہے لیکن افسوس ہے کہ بے وجہ جوش ہماری
آرزو کو تاریک کر دیتا ہے اور ہم اس جوش میں ایسی طفلانہ حرکات کر دیتے ہیں جن کا مفید
اثر کچھ نہیں ہوتا اور جن کا نقصان دیرپا ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ
امریکا اور جرمن کی چیزیں خرید و مگر انگلستان کی چیزوں کو ہندوستان کے بازاروں سے
خارج کر دو۔ مجھ کو تو اس کا اقتصادی فائدہ کچھ نظر نہیں آتا بلکہ اگر انسانی فطرت کے محرکات
پر غور کرو تو اس میں سراسر نقصان ہے۔ اس طریق عمل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان
سے ہم کو سخت نفرت ہے۔ نہ یہ کہ ہم کو ہندوستان سے محبت ہے اپنے وطن کی محبت کسی
غیر ملک کے مستلزم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اقتصادی لحاظ سے اس میں کچھ فائدہ نہیں
ہے۔ مغربی خیالات اور تعلیم کی اشاعت سے اب ہماری ضرورتوں کا احاطہ وسیع ہو گیا ہے
اور اسی میں سے بعض اس قسم کے ہیں کہ سرِ دست ہمارا اپنا ملک ان کو پورا نہیں کر سکتا
پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس طفلانہ فعل سے سوائے اس کے کہ حکام کو خواہ مخواہ بدظن کیا
جائے اور کیا فائدہ ہے۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ہمارا ملک
بعض خصوصیات اور دیگر قدرتی اسباب کے عمل کی وجہ سے ان کو ارزاں نرخ پر

تیار ہی نہیں کر سکتا اس بات کی کوشش کرنا کہ ہماری ساری ضرورتیں اپنے ملک کی خصوصیات سے پوری ہو جایا کریں، سراسر جنون ہے۔ واقعات کے لحاظ سے دیکھو تو یہ بات کسی ملک کو نہ اب نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور اگر یہ بات ممکن بھی ہو جائے تو اس میں میرے خیال میں بجائے فائدہ کے نقصان ہے جس کی مفصل تشریح اس مقام پر نہیں ہو سکتی۔

سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لئے میری رائے میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

ا۔ وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کی کمیت اور کیفیت کیا ہے۔

ب۔ وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوتی تھیں اور اب تیار نہیں ہوتیں۔

ج۔ وہ کون سی مصنوعات ہیں جن کو ہم خصوصیت سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں۔

د۔ ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لئے موزوں ہیں۔

(ا) تخمیناً کس قدر سرمایہ زیورات وغیرہ کی صورت میں ملک میں معطل پڑا ہے، اور اس کو استعمال میں لانے کے لئے کیا وسائل اختیار کئے جائیں ان تمام امور کو ملحوظ رکھ کر عملی کام شروع کرنا چاہیئے، ضرور ہے کہ ابتدا میں ناکامی کا سامنا بھی ہو مگر کوئی بڑا کام سوائے قربانی کے نہیں ہوا۔ کسی ملک کے اقتصادی حالات کا درست ہونا تھوڑے عرصے کا کام نہیں ہے اس میں صدیوں کی ضرورت

ہے ہم نقصان اٹھائیں گے تو ہماری آئندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں گی علاوہ اس کے مشترک سرمایہ کی جماعتیں نہایت مفید ثابت ہوں گی خصوصًا ہمارے ملک میں جہاں کے لوگ کم سرمایہ رکھتے ہیں سرمائے کے بہترین نتائج اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اس کی مقدار بڑی ہو۔ مگر عملی لحاظ سے کامیاب ہونے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اصلاح اخلاق کی ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاؤ ان کے اسراف عادات پر نکتہ چینی کرو اور ان کے دل پر یہ امر نقش کر دو۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد خود غرضی کے پردے میں بنی نوع انسان کی بہتری کی جستجو کرنا ہے۔ افسوس کہ میں جیسا چاہتا تھا ویسا جواب نہیں لکھ سکا کچھ اس خیال سے کہ ڈاک کا وقت جاتا ہے اور کچھ اس خیال سے کہ زیادہ تعویق مناسب نہ ہوگی۔

(۲) سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت پیدا نہ ہوگی اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعہ افراد کی پروا نہیں کرتی۔

مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اور عملی زندگی اس قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے، خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔

میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے کہ

ایک صاحب نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ عام طور پر مسلمان زراعت پیشہ ہیں۔ ان کا یہ ارشاد شاید پنجاب کی صورت میں صحیح ہو تاہم کو یہ کہنا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کو سودیشی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ نہیں ہے اگر مصنوعات سستی ہوں (جو بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا نتیجہ ہوگا) تو خریدنے والوں کو بھی فائدہ ہے اور بیچنے والوں کو بھی۔ مسلمان خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے ہر طرح فائدہ میں ہیں۔ ہاں اگر وہ بیچنے والے ہیں تو ان کو زیادہ فائدہ ہے اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ بائع نہ بنیں۔

(۳) اگر صبر و استقلال سے کام لیا گیا تو اس تحریک میں ضرور کامیابی ہوگی دور اندیشی تمام کامیابی کا راز ہے ایک حد تک تو اس تحریک کے مطابق ملک میں عملدرآمد ہو رہا ہے اس عمل کے لئے توسیع کی ضرورت ہے جو اس ضرورت میں ممکن ہے کہ عمدہ اور ارزاں مصنوعات پیدا کر کے گراں اور ظاہری نمائش والی چیزوں کو ملک سے نکالنے کا مقدس عہد لینا کہ ہم خارجی ممالک کے مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے اور جوش میں آکر انگریزی کپڑے کے کوٹ کو آگ میں پھینک دینا ایک طفلانہ فعل ہے جو اقتصادی لحاظ سے غیر مفید اور سیاسی لحاظ سے مضر ہے اگر اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیئے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اللہ میرے دیرینہ وطن کا نام جلی قلم سے فرق اقوام میں لکھا جائے۔ والسلام

اقبال

زانہ مئی ۱۹۰۶ء
(کیمبرج انگلستان)

جنگ کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء

قائداعظم محمد علی جناح

# ہمارا قومی شاعر — اقبالؒ

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے حضرت علامہ مرحوم و مغفور کی زندۂ جاوید شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ۱۹۴۴ء میں، یومِ اقبال کے موقع پر ایک پیام دیا تھا۔ جس کی اصل میاں محمد شفیع کی عنایت سے ہمیں مل گئی ہے۔ قائداعظم کے اس پیام کا جو انگریزی زبان میں ہے، اردو ترجمہ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔

آج کے دِن میں اپنے **قومی شاعر — اقبالؒ** کی مقدّس یاد میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں، آج کے دِن ہم اس شخص کی یاد منا رہے ہیں جو ایک بہت بڑا شاعر، خدا شناس درویش، فلسفی اور مفکّر تھا۔ میں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ مرحوم کی رُوح ابدی طمانیت سے بہرہ ور ہو۔

آج اقبال ہم میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کے شعر جو لافانی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ہماری رہنمائی اور ہمارے دِلوں میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے

ہم میں ہمیشہ موجود رہیں گے ، ان کے اشعار اپنی ہیئت کی دلآویزی اور زبان کی شیرینی کے علاوہ اس عظیم المرتبت شاعر کے دل و دماغ کی صحیح معنوں میں عکاسی بھی کرتے ہیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ محبوب شخصیت اسلام کی تعلیمات کی کس قدر گرویدہ تھی ۔ مرحوم رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک سچے اور مخلص پیرو تھے ۔ وہ سب سے پہلے مسلمان تھے اور سب سے آخر میں بھی مسلمان ہی تھے ـــ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے ۔

اقبال محض ایک پیغامبر اور فلسفی ہی نہ تھے ۔ انہوں نے ہمت و جرأت، عمل و سعی پیہم، خود اعتمادی سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور خدمتِ اسلام کی بھی دعوت دی، ان کی ذات گرامی حامل تھی ایک طرف شاعر کی مثال پسندی ، اور دوسری طرف ایک ایسے آدمی کی حقیقت پسندی جو اپنی گرد و پیش کی چیزوں کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو ، خدا تعالیٰ پر یقین محکم اور مسلسل اور پیہم جدو جہد ـــ مختصراً یہ ہے روح اقبال کے پیام کی ، اور اس کے پیام کی یہی خصوصیت اقبال کو ایک سچے مسلمان کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ۔

اقبال کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر غیر متزلزل یقین تھا ۔ اس کے نزدیک ایک فرد کے زندگی میں کامیابی کے معنی یہ تھے کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا ، اور وہ تھا تعلیماتِ اسلام کی پیروی ، اقبال نے انسانیت کو بھی پیہم عمل اور تکمیل ذات ہی کے ذریعہ اپنی فلاح حاصل کرنے کی دعوت دی ۔

بے شک اقبال ایک بہت بڑے شاعر اور فلسفی تھے ۔ لیکن ایک عملی

سیاست دان کے لحاظ سے بھی وہ کچھ کم حیثیت کے مالک نہیں تھے، دینِ اسلام کے نصب العین اور اس کے شاندار مستقبل پر یقین کامل رکھنے کی وجہ سے اقبال ان معدودے چند افراد میں سے ایک ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے اِس امکان پر سوچ بچار کی کہ برِعظیم ہند کے شمالی مغربی اور شمالی مشرقی علاقوں کو جو کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تاریخی وطن ہے۔ اس سے الگ کر کے ایک اسلامی ریاست بنا دی جائے۔

آپ لوگوں کے ساتھ "یوم اقبال" منانے میں خلوص دل سے شریک ہوتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ ہمیں اس امر کی توفیق دے کہ ہمارے قومی شاعر نے جن اصولوں کی ہمیں دعوت دی تھی۔ ہم ان کے مطابق اپنی زندگیاں بنائیں تاکہ پاکستان کا مقصد ہمیں حاصل ہو، اور اس میں جب کہ وہ قائم ہو جائے ہم ان اصولوں کو جن کی اقبال نے دعوت دی تھی، عملی جامہ پہنا سکیں۔

۷/۴/۴۴

محمد علی جناح

M.A. Jinnah.

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی

# علامّہ اقبال اور طبِ اسلامی

## علامّہ مرحوم سے ایک مُلاقات

اکتوبر ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے۔ کہ کچھ طبیب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ ہمارے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں چلئے۔ کیونکہ وہ طب اسلامی کے متعلق کچھ امور معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ اطبّا علامہ مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور اُن سے درخواست کی تھی۔ وہ طب کی حمایت میں ایک جلسہ کی صدارت فرمائیں۔ اس پر انہوں نے کچھ سوالات کئے۔ جس پر ان اطبّا نے کہا۔ کہ اگر آپ طب کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہم ایک اور طبیب کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ اور وہ آپ کو تسکین بخش جواب دے سکیں گے۔

میں ان اطبّا کے ساتھ علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم جس وقت میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچے۔ تو عصر کا وقت تھا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی علی بخش

سے ملاقات ہوئی ۔ اس نے بتایا ۔ کہ ڈاکٹر صاحب برآمدے میں تشریف رکھتے ہیں ۔ اور بعض حضرات سے گفتگو کر رہے ہیں ۔ اس نے کہا آپ حضرات بھی وہیں چلے جائیں ۔

ہم برآمدے میں چلے گئے ۔ اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ حضرت علامہ ایک صاحب سے گفتگو فرما رہے تھے ۔ یہ صاحب غالباً مالیر کوٹلہ کے نواب محمد علی تھے ۔ گفتگو کا موضوع احمدیت کی تحریک کے اثرات تھے ۔

تھوڑی دیر بعد علامہ مرحوم ہماری طرف مخاطب ہوئے ۔ ایک صاحب نے کہا ۔ کہ ہم قرشی صاحب کو لائے ہیں ۔ آپ ان سے مبادلہ افکار فرمائیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا ۔ بہتر ہو گا ۔ آپ کسی طبیب کو اس جلسہ کا صدر بنا لیں ۔ مگر شاید طبیبوں میں جذبہ مسابقت ہو ۔ مگر میں نے کہا ۔ کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ طبیب صدر ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ مگر چونکہ یہ جلسہ بہت اہم ہے ۔ اور اس میں ہم طب کے خلاف حکومت پنجاب کے بیان پر احتجاج کرنا چاہتے ہیں اسی لئے ہماری خواہش ہے کہ آپ اس جلسہ کی صدارت فرمائیں ۔ اس سے اس احتجاج کی اہمیت ہو جائے گی ۔ یوں بھی آپ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں لاہور کی نمائندگی فرما رہے ہیں ۔ اس طرح اس بیان کے متعلق لاہور کے جمہور کے جذبات ظاہر ہو جائیں گے ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم عام طور پر صدارت کو پسند نہیں کیا کرتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے گریز کیا ۔ ایک دوسرا طریق اختیار کیا ۔ اور فرمایا ۔ کہ جلسوں کی صدارت کے لئے تو سر عبدالقادر مخصوص ہیں ۔ کیوں نہ آپ ان کی طرف رجوع کریں ۔ میں

نے عرض کیا۔ شیخ صاحب کو ہماری طب سے بہت ہمدردی ہے اور وہ بعض طبی جلسوں کی صدارت فرما چکے ہیں۔ اب کے ہماری خواہش ہے۔ کہ آپ اس جلسہ کے فرائض صدارت سرانجام دیں۔ اس طرح آپ کی سی بین الاقوامی شہرت کی شخصیت کی طب سے وابستگی ہمارے لئے بہت مفید ہوگی۔

اس پر علامہ مرحوم نے فرمایا۔ اچھا یہ تو کہئے۔ کہ آپ کے پاس طب کی خوبی کے کیا دلائل ہیں۔ میں نے کہا۔ ملکی آب و ہوا میں ہمارا دیسی طریق علاج زیادہ مفید ہے۔ ہماری دوائیں یہاں کے رہنے والوں کے لئے زیادہ موافق ہیں۔ اقتصادی طور پر بھی یہ ہمارے لئے موزوں ہیں۔ کیونکہ نسبتاً کم قیمت ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے استعمال سے ہم اپنے ملکی سرمایہ کو اپنے ملک ہی میں رکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ یہ طریق علاج مغربی طریق علاج کے مقابلہ میں کہاں تک مفید ہے اور آیا جمہور اس کو پسند کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا۔ حکومت مدراس نے اسی امر کو معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ جس کے صدر سر محمد عثمان اور سیکرٹری ڈاکٹر سری نواس مورتی تھے۔ اس نے ڈیڑھ سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دیسی طریق علاج زیادہ مفید اور شفا بخش ہے۔ جہاں تک جمہور کا تعلق ہے۔ سر پاڈے لیوکس ڈائرکٹر جنرل میڈیکل ڈیپارٹمنٹ حکومت ہند کی شہادت کے مطابق ۸۰ فیصدی ہندوستانی دیسی طریق علاج سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں جہاں یہ قدیم طریق علاج کے شفا خانے موجود ہیں۔ مثلاً لکھنؤ۔ امرت سر وہاں دیسی دواخانوں کی طرف رجوع زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ مگر جدید میڈیکل سائنس نے جو ترقی کی ہے اس کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سائنس نے بلاشبہ بعض شعبوں میں بہت زیادہ ترقی کی ہے مگر میڈیکل سائنس کی ترقی مشتبہ ہے۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے طب قدیم نے دق وسل۔ صرع۔ سرطان۔ فالج وغیرہ جن امراض کو لاعلاج قرار دیا تھا۔ آج بھی ان کی شافی دوائیں میسّر نہیں ہیں۔ اگر میڈیکل سائنس واقعی غیر معمولی ترقی کرتی۔ تو مریضوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ نہ ہوتا۔ درحقیقت یورپ نے مسلمانوں سے علم طب لے کر اسے یورپ کی آب و ہوا اور اپنی معاشری ضرورتوں کے مطابق بنا لیا ہے جو ہمارے لئے زیادہ مفید نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ جدید طریق علاج کو روک دیا جائے۔ بلکہ ہماری خواہش ہے کہ دیسی طریق علاج کو بھی پنپنے کا موقع دیا جائے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اگر آپ اسی طرح بحث و تمحیص کرتے رہیں گے۔ تو آپ کے لئے ان کے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہو گا۔ کہ آپ ڈاکٹر صاحب سے کہیں کہ وہ اس جلسہ کی ضرور صدارت فرمائیں۔ اور بحث کو ختم کر دیں۔

اس پر ڈاکٹر صاحب مسکرا دیئے۔ اور ہم ان سے صدارت کا وعدہ لے کر واپس چلے آئے۔ یہ جلسہ محمڈن ہال میں ہوا۔ میں نے جلسہ میں ایک طویل تقریر کی۔ جس میں مسٹر بینز سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کے تمام اعتراضات کے مفصّل جوابات دیئے کچھ تجاویز منظور کی گئیں۔ اور آخر میں ڈاکٹر صاحب نے طبِ قدیم کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ کہ حکومت تجارتی

اغراض کی وجہ سے طب جدید کی ترویج کی حامی ہے۔ آپ نے حکومت پنجاب پر زور دیا۔ کہ وہ مناسب طریق پر طب قدیم کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس کے بعد جب لیجسلیٹو کونسل میں طب قدیم کے متعلق بحث ہوئی۔ تو وہاں ۵۰ ڈاکٹر صاحبان نے طب کی تائید میں تقریر ارشاد فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسٹر بینرلے کا وہ بیان مسترد ہوگیا۔ اور لیجسلیٹو کونسل نے طب دیسی کی ترقی و ترویج کی تجویز منظور کرلی۔ گو یہ حکومت کی تطویل و تاخیر کی پالیسی کی وجہ سے کبھی شرمندہ عمل نہیں ہوئی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب نے مولوی ظفر اقبال کے توسط سے مجھے یاد فرمایا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ پروفیسر براؤن نے طب عربی میں جو رائے ظاہر کی ہے۔ کہ طب کی تدوین میں مسلمانوں کا ذاتی سرمایہ بہت کم ہے۔ اس کی تردید کی جائے اور تفصیل سے بتلایا جائے۔ کہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں مستقل حیثیت سے کیا کچھ کیا ہے۔ اتفاق سے میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اُس وقت حاضر نہیں ہو سکا۔ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر صاحب کو درد گُردہ کے شدید دورے پڑے۔ انہوں نے ڈاکٹروں کی جانب رجوع کیا۔ مگر ان سے فائدہ نہیں ہوا۔ اور انہوں نے عملیہ (اپریشن) کا مشورہ دیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اسے پسند نہ کیا۔ اور اسلامی طب کے مشہور ماہر حکیم نابینا صاحب کے علاج سے ان کو فائدہ ہوگیا۔ اس پر ڈاکٹروں کو تعجب ہوا۔ انہوں نے چاہا۔ کہ ایکس رے کے ذریعہ معلوم کریں کہ سنگ گردہ باقی ہے یا نہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ کہ مجھے جب درد نہیں ہے۔ تو اس کی کیا ضرورت ہے۔ بعض ڈاکٹروں کی رائے

تھی۔ کہ پتھری نے گردوں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ اس لئے درد رُک گیا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ کہ اُن کو تکلیف سے نجات مل گئی ہے۔ اب وہ ڈاکٹروں کے تعجّب کو دُور کرنے کے لئے مفت کی پریشانی میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔

اس علاج سے ان کو طب اسلامی کے متعلق عقیدت ہو گئی۔ اس کے بعد جب ۱۹۳۴ء میں گلے کی شکایت ہوئی۔ تو پھر بھی ان کو ڈاکٹروں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ اور طب اسلامی سے ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس سے متاثر ہو کر انہوں نے اکسیر روح الذہب کی تعریف میں تحریر کیا ؎

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تن خاکی مرا

ایک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب

ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبح ازل

دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی روح الذہب

اس کے بعد جب ان کو قلب کی تکلیف ہوئی۔ اس وقت بھی ڈاکٹری علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ دوستوں اور عزیزوں کے کہنے پر اس طریق علاج کی طرف رجوع کرتے تھے مگر پھر گھبرا کر چھوڑ دیتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ انگریزی دواؤں میں ذائقہ کا خیال ہے نہ پسند کا۔ اور یہ خدمتِ خلق کی جگہ تجارت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ان کے مقابلے میں طبّی دوائیں لطیف اور خوش مزہ ہیں۔ اور مسلمانوں کے ذوق جمال اور نفاست طبع پر دلالت کرتی ہیں۔ قلب کے عوارض میں ان کو زیادہ تر خمیرہ گاؤزبان عنبری۔ جواہر مہرہ اور دواالمسک سے فائدہ ہوتا تھا۔ اور ان کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔

ان کو نبض پر اعتماد تھا۔ اور وہ جانتے تھے۔ کہ طبیب کے لئے آلات سے کہیں زیادہ تربیت حواس کی ضرورت ہے۔ ان کو جدید طب پر یہ بھی اعتراض تھا۔ کہ وہ انسان کو محض ایک مشین قرار دیتی ہے۔ اور اس کے نفسیاتی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ اسی لئے وہ ایک مرض کے لئے ایک ہی طریق علاج تجویز کرتی ہے۔ حالانکہ علاج مریض کا ہونا چاہیئے نہ کہ مرض کا اس لئے وہ طب اسلامی کی مزاج کی تقسیم کو بہت پسند کرتے تھے۔ بلکہ ان کا تو خیال تھا۔ کہ طب انفرادی ہونی چاہیئے کیونکہ ہر شخص کا انا منفرد ہے (طب اسلامی میں اس نظریہ کی تائید کی گئی ہے اور اعتدال شخصی میں اس پر بحث کی گئی ہے)

انہوں نے ایک دفعہ فرمایا۔ کہ اٹلی کے ایک مشہور ڈاکٹر نے اس نظریہ کو پسند کیا ہے۔ اور وہ انفرادی طب کی تدوین کر رہا ہے۔ علامہ مرحوم نے 'انا' کے متعلق بہت کچھ تحریر کیا ہے اور اسے نظام حیات کا محافظ و مصلح قرار دیا ہے۔ نیز اس کی انفرادیت پر زور دیا ہے۔ اطالوی ماہر نے علامہ مرحوم کے کلام سے انہی امور کو اخذ کر کے انفرادی طب کی تدوین کی ہے طب اسلامی میں یہ نظریات موجود ہیں۔ چنانچہ مزاج کی بحث میں انفرادی طبائع کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ مرحوم کا 'انا' بھی طب اسلامی کی طبیعت مدبرہ بدن کے قریب قریب ہے۔ جو جملہ امور بدن کی مصلح و محافظ ہے۔ درحقیقت طب اسلامی ان کے فلسفہ اور ذوق سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ نیز یہ مسلمانوں کا قیمتی ورثہ ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس کی ترقی و ترویج کے آرزومند رہے۔

امروز ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء

محمد سرور

# اقبالؔ کی ایک پیش گوئی

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں ٭ خویش را زیں تندباد آرد بیروں
روس

اقبال مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اسلام عبارت ہے اشتراکیت جمع ایک خدا کا عقیدہ ہ — وہ مارکس کی مادیّت سے بے زار تھے ـ اور اُسے گم رہی سمجھتے تھے ـ اور روس میں جو اشتراکی انقلاب ہوا، وہ اس کے بعض پہلوؤں کے تو بڑے مدّاح تھے، لیکن اس کی لادینیت اُن کے نزدیک غلط کاری اور غلط فہمی کا نتیجہ تھی ـ اور اُن کا یقین تھا کہ اگر اشتراکیت کو انسانیت کی نئی تعمیر کرنا ہے ـ تو ضروری ہے کہ وہ اس گُم رہی سے نکلے، اور صحیح دین ـ رسمی؛ قبائلی اور قومی دین نہیں بلکہ وہ دین جو مرادف ہے فطرت اللہ سے، جس پر کہ انسان کی تخلیق ہوئی ہے ـ کے اساس پر اپنے نظام کی بناء رکھے ـ

خواجہ غلام السیّدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے، روحانیت

کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا ... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے ۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے ۔ باقی رہا سوشلزم۔ سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کے ساتھ ہی علاّمہ مرحوم کا یہ خیال تھا کہ اس وقت روس میں لادینیت کی جو رو چل رہی ہے وہ عارضی ہے۔ اور اگر روسیوں کو اپنی فلاح مقصود ہے۔ تو وہ بہت جلد اس لادینیت سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔

۳۰ر جولائی ۱۹۳۰ء میں لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں وہ روسی اشتراکیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ روسی لوگ فطرتاً لامذہب نہیں ہیں بلکہ میری رائے میں وہاں کے مرد اور عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معیّنہ مدّت تک قائم نہیں رہے گی ۔ یہ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کا نظام دہریت کی بنیاد پر دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ حالات کے اپنے معمول پر آجانے کے بعد جونہی لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا۔ انہیں یقینی طور پر اپنے نظام کے لئے کسی مثبت بنیاد کی تلاش کرنا ہوگی ۔

اقبال کا خیال تھا کہ اگر اسلام صحیح معنوں میں روسیوں کے سامنے پیش کیا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ کیونکہ بالشوزم کی بنیادی خامی کو اگر کوئی چیز دُور کرسکتی ہے، تو وہ اسلام ہے جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اور جس کی تشریح انہوں نے اپنے کلام میں فرمائی ہے۔ اُسی "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے مضمون میں اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے :۔

اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کرلیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آجاتا ہے۔ اس لئے میں متعجّب نہ ہوں گا۔ اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔

اس مطلب کو انہوں نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

اقبال کا یہ خیال کہ "روس کی موجودہ لادینیت دیرپا نہیں، اور یہ کہ "روسی لوگ فطرتاً" لا مذہب نہیں۔ اور ان کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معیّنہ مدّت تک قائم نہیں رہے گی۔ اور ایک دِن آئے گا کہ وہ اپنے نظام کے لئے مثبت بنیاد کی تلاش پر مجبور ہوں گے"۔ ہمارے خیال میں بہت صحیح ہے۔ اور روس کے بارے میں غیر جانبداروں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے علاّمہ مرحوم کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی لیڈروں کی تمام مذہب دشمن کوششوں کے باوجود روسی عوام میں اب تک مذہب کے اثرات موجود ہیں اور ناممکن ہے کہ

دہریت روسی مردوزن کا مذہب بن جائے ۔ یہ فطرتاً محال ہے اور انسانی طبیعت کے خلاف ۔

گذشتہ بیس سال میں روس میں مذہبیت اور لامذہبیت کی لڑائی جس طرح لڑی گئی اور اشتراکیت کے مبلّغوں نے مذہب کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی جو مساعی کیں ۔ مندرجۂ ذیل سطور میں اُن کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا جاتا ہے ۔ اور ان کے جو نتائج نکلے آخر میں اُن کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے ۔ ان تمام تفصیلات سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا ۔ کہ اس معاملہ میں اقبال کی نظر کتنی صائب تھی ۔ اور اشتراکیت کے جھنڈے تلے مذہب اور لامذہب کے درمیان روس میں آج کل جو ٹکر ہو رہی ہے ، اس کے بارے میں مرحوم کی پیش گوئی کس قدر صحیح ثابت ہو رہی ہے ۔

## سنہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب

۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب ہوا ۔ تو زار کے ساتھ مذہب اور مذہب والے بھی مردود قرار دیئے گئے ۔ بات یہ تھی کہ زار خدا کا اوتار بن کر روسیوں پر حکومت کرتا تھا ۔ اور بشپ اور پادری اس خدائی میں اس کے یار و مددگار تھے ۔ زار گیا تو اس کے ساتھ بشپوں اور پادریوں کا جانا بھی ضروری تھا ۔ زار روسیوں کی مادی زندگی اور اس کی ضروریات کو لوٹتا کھسوٹتا تھا ۔ اور پادری ان کی باطنی اور روحانی زندگی پر مسلّط تھے ۔ لینن اور اس کے ساتھی ایک نئے

دنیا کی تعمیر چاہتے تھے ۔ وہ ایک ایسی انسانیت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جس کا جسم بھی آزاد ہو اور رُوح بھی آزاد ۔ چنانچہ انہوں نے مذہب کو بزعم خویش سرمایہ داری کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی وجہ سے سرمایہ داری ہی کا ایک رُخ سمجھا اور اسے مٹانے کی تدبیریں کیں۔

انقلاب میں انتہا پسندی اور شدّت نہ ہو ۔ تو وہ انقلاب ہی نہیں۔ انقلابی ایک جنون کے ساتھ اُٹھتا ہے ۔ وہ ماضی سے صرف بے زار ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا ہے ۔ وہ انقلاب سے پہلے کی ہر چیز کو کُفر سمجھتا ہے ۔ اور اسے نیست و نابود کرنا اس کا ایمان ہوتا ہے ۔ میانہ روی اور اعتدال پسندی اگر کوئی خوبی ہے ۔ تو انقلابی اس سے کلیتہً محروم ہوتا ہے ۔ اس کے نزدیک میانہ روی نفاق سے کم نہیں ہوتی ۔ وہ پُرانی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر نئی بنیادوں پر اپنی زندگی تعمیر کرنا چاہتا ہے ۔ ہر انقلاب میں یہی ہوا ۔ خواہ وہ روس کا انقلاب ہو ۔ یا فرانس کا انقلاب یا کسی اور ملک اور قوم کا ۔

اب دیکھنا یہ ہے ، کیا انقلاب ماضی اور اُس کی روایتوں کو یکسر تہس نہس کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ اور انقلاب سے بعد کی دنیا ما قبل انقلاب کی دنیا سے بالکل بے تعلق ہوتی ہے ۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انقلاب کی گرما گرمی کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ خصوصیات اور رجحانات جو قوم کے دلوں اور دماغوں میں صدیوں سے راسخ چلے آتے ہیں ۔ وہ پھر اُبھرنے لگتے ہیں ۔ لیکن انقلاب سے پہلے جس رنگ میں ان کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اپنے لئے کوئی نئی صورت تراش لیتے ہیں ۔ بہر حال انقلاب کا ہنگامہ خواہ

وہ کتنا سخت ہو قوم کے ذہن اور اس کی جبلّی خصوصیات کو نابود نہیں کرسکتا۔

## اہلِ علم اور اہلِ مذہب کے خلاف مہم

بے شک اشتراکی لیڈر "اربابِ علم" سے بھی بدظن تھے۔ چنانچہ جب انقلاب ہوا۔ تو بہت کم پروفیسر ایسے تھے جو اشتراکیت سے ہم نوا ہوں۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر تر سائبیریا میں جلا وطن کئے گئے۔ اور بعض کو دیس نکالا ملا۔ اکثر مرکھپ گئے اور رہے سہے یا تو بے اثر ہو گئے اور یا نئے دھڑے پر لگ گئے، اور اس طرح روس کی علمی اور فکری زندگی بالکل اشتراکی لیڈروں کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن اہلِ علم سے کہیں زیادہ ان کو مذہب کی قوّت و اثر سے خطرہ تھا۔ اور وہ شروع سے ہی اس کے زور کو توڑنے کی فکر میں تھے۔ پہلے پہل تو بپٹسٹ فرقہ اور غیر مقلّدوں سے رعایت برتی گئی۔ لیکن بعد میں ان کی جماعتوں کو بھی اوروں کی طرح ختم کر دیا گیا۔ ان جماعتوں کے اکثر بڑے بڑے پادری سائبیریا میں موت کی نذر ہوئے۔ اور بعض اُن میں سے جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ جو باقی بچے انہیں اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی جماعتوں سے ربط و ضبط بڑھائیں۔ آئندہ کے لئے پادریوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ گو خفیہ اس کی کوششیں برابر جاری رہیں۔

حکومت کی طرف سے مذہب کے خلاف جو پروپیگنڈا شروع کیا گیا۔ وہ زیادہ مؤثر نہ ہوا۔ مذہب کی مخالفت میں عام طور پر جو دلیلیں دی جاتی تھیں وہ اتنی بودی تھیں کہ لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر روس کے

ایک ممتاز اخبار میں دو ہوا بازوں کا ایک بیان چھپا کہ ہم نے فضا میں اُونچا اُڑ کر دیکھا ہے، وہاں تو ہمیں کوئی خدا نظر نہیں آیا۔ زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا۔ کہ دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔ زراعت میں مشین سے کام لیجئے تو دیکھئے کتنا غلّہ پیدا ہوتا ہے۔ ان مخالفین مذہب کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی۔ کہ علم اور سائنس کی ترقی نے رُوح اور روحانیت کا وجود بے کار محض کر دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں ماسکو کے خلافِ مذہب عجائب خانہ میں انسان کے دل و دماغ کی زندگی کو شریانوں اور اعصاب کی شکل میں پیش کیا گیا۔ بدقسمتی سے الحاد اور بے دینی کے ان مجاہدین نے عوام کی ذہنیت کو غلط سمجھا۔ اور اس طرح کی بیکار باتوں سے اپنا بھی وقت ضائع کیا اور ان پر بھی کچھ اثر نہ ہوا۔

خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

منکرین مذہب کی یہ یلغار ایک لحاظ سے روسی چرچ کے لئے مفید ثابت ہوئی، زار شاہی کے آخری ایّام میں سرکاری مذہب ہونے کی وجہ سے عیسائیت اتنی مسخ ہو چکی تھی اور اس میں اتنی خرابیاں اور بے جا نمود و نمائش کی باتیں آگئی تھیں۔ کہ ابتلا کی اس بھٹی میں پڑ کر وہ بہت سی آلائشوں سے پاک ہو گئی اور اب سارا زور انجیل اور صرف انجیل پر دیا جانے لگا۔ عبادت کی وہ رسمیں جن میں رُوح پرور اور کیف انگیز موسیقی ہوتی۔ ان میں لوگ بڑی خوشی اور شوق سے شریک ہوتے۔ اور اشتراکی بھی اس کی مخالفت نہ کرتے تھے۔ بے شک نئے دور میں عیسائیت کی حیثیت سرکاری مذہب کی نہ رہی لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مذہب دنیاوی اور ظاہری فضولیات

سے نکل گیا۔ مذہب کی صحیح رُوح جس قدر اس زمانہ میں دلوں میں جاگزیں ہوئی تھی شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو ۔ کیونکہ اب عقیدے اور مذہب کی خاطر مشکلات اور مصائب کے امتحان سے گزرنا ہوتا ۔ اور دلوں میں خلوص و ایثار نہ ہو تو خالی خولی نمائش سے کام نہیں چل سکتا تھا۔

## نئے مذہبی رُجحان کا ظہُور

روسیوں کے اس نئے مذہبی رُجحان کے بارے میں اشتراکی وزیر تعلیم لیونا چرسکی کا بیان ملاحظہ ہو۔ خلاف مذہب تحریک کے چلانے والوں میں سے ایک ممتاز لیڈر یہ بھی تھا۔ وہ کہتا ہے :

"مذہب کی مثال تو ایک کیل کی سی ہے ۔ اس کو جس قدر ٹھوکئے اسی قدر وہ لکڑی میں اور گھُسی چلی جاتی ہے ۔"

مذہب کی مخالفت کرنے والوں میں ایمیلن یا روسوسکی جیسا ذہین ممتاز صلاحیتوں کا آدمی بھی ہے ۔ "یہ منکرین خدا" جماعت کا صدر تھا۔ مگر اس جماعت کی حیثیت سرکاری نہیں تھی اور اس کے ارکان یہ خدمت رضاکارانہ طور پر کرتے تھے ، لیکن ظاہر ہے ۔ سرکاری سرپرستی اور مدد کے بغیر یہ جماعت نہیں بن سکتی تھی ۔ یہ جماعت اب بالکل ختم ہو چکی ہے ۔ اور ایمیلن کو خود اعتراف ہے کہ اس کے ساتھی بے دلی سے کام کرتے تھے ۔ اس کے برعکس مذہبی طبقے والے نہایت گرم جوشی سے رفاہِ عام کے کام سرانجام دیتے ۔ ایمیلن کا خیال ہے کہ زبردستی گرجوں کو بند کرنا ٹھیک نہ تھا۔ اس سے عوام اور بھڑک

جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ پادریوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ تاکہ ع

نہ ہوگی تانت نہ بجے گا باجا

۱۹۲۹ء میں پنج سالہ تعمیری پروگرام کے ساتھ ساتھ مذہب کے خلاف بھی محاذ قائم کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دستور حکومت میں بھی تبدیلی کی گئی۔ اب تک دستور میں یہ صراحت تھی کہ " مذہب اور خلاف مذہب پروپیگنڈا دونوں کی اجازت ہے "۔ لیکن ۱۴ اپریل ۱۹۲۹ء کو یہ ترمیم ہوئی کہ مذہب کا لفظ اڑا دیا گیا اور صرف خلاف مذہب پروپیگنڈے کی اجازت رہ گئی۔ اس کے علاوہ ادھر ادھر کے اور قوانین کو یک جا کرکے ایک ہمہ گیر قانون وضع کیا گیا۔ مختصر طور پر یہ ہوا کہ گرجوں کی جماعتی زندگی کو یکسر ممنوع قرار دیا گیا۔ اور انہیں صرف مذہبی مراسم کی بجا آوری کی اجازت رہ گئی۔ نیز پادریوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی گئیں۔ اور انہیں قصبوں اور شہروں میں عام لوگوں کے ساتھ رہنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اب تک تو یہ حال تھا کہ تعلیم میں اب مذہب سے کوئی بحث نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب حکماً مدرسین کو درس کے دوران میں مذہب کی مخالفت کرنی پڑتی تھی۔

مخالفینِ مذہب کی یہ کوشش بھی بارآور نہ ہوئی۔ روسی بچے جرمن بچوں سے کہیں زیادہ تنقیدی مزاج رکھتے ہیں۔ اور ان کے گلے سے زبردستی کسی بات کا نکلوانا قدرے مشکل ہے۔ چنانچہ دن رات ہر لمحہ ان کے سامنے یہ الاپنا کہ " خدا کوئی نہیں "۔ بے معنی سی بات ہے۔ اس سے الٹا ان میں تجسس کا رجحان بڑھتا اور لامحالہ یہ سوچتے کہ اگر خدا کوئی نہیں۔ تو پھر یہ اتنا شور و شر کیوں۔

مخالفین مذہب کی یہ ساری جد و جہد محض منفیانہ حیثیت کی تھی۔ اور ظاہر ہے اثبات کے بغیر نفی سے کیا نتیجہ نکلے گا۔ اور اگر الاّ نہ ہو تو لاّ سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک کتاب کے ساتھ ایک "غلط نامہ" لکھا گیا تھا۔ جس میں درج تھا۔ کہ جہاں کہیں God بڑی G سے لکھا ہے اسے god چھوٹی g سے پڑھو۔ کتاب میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا تھا، غلط نامہ میں سب کا حوالہ دیا تھا۔ اس قسم کی بدمذاقی تو شاید زار کے بدترین زمانے میں بھی کبھی نہ کی گئی ہو گی۔

## ایت وار کی چھٹی

مذہب کے اثر کو کم کرنے کے لئے دو اور تدبیریں جو بظاہر دوسرے کاموں کے سلسلہ میں کی گئی تھیں بڑی کارگر ثابت ہوئیں۔ نئے صنعتی پروگرام میں پانچ دن کا ہفتہ طے پایا اور چھٹی کے لئے کوئی خاص دن مقرر کیا گیا۔ بلکہ کاریگر باری باری سے چھٹی کر لیتے تھے۔ اس انتظام سے عام بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ کیونکہ ایک خاندان کے لوگ جو مختلف کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ ایک دن سب مل کر چھٹی نہیں منا سکتے تھے۔ حکومت شہری کاریگروں کے طبقے کو ناراض نہیں کر سکتی تھی چنانچہ پانچ دن کے ہفتہ کی بجائے چھ دن کا ہفتہ کیا گیا جس میں پانچ دن کا کام ہوتا تھا اور چھٹے دن عام چھٹی ہوتی۔ لیکن یہ چھٹی ایت وار کو نہ پڑتی تھی۔ اس سے یہ ہوا کہ ایت وار کے دن عبادت گزاروں کا جمع ہونا مشکل ہو گیا اور گرجوں میں جانے والوں کی گنتی بہت کم ہو گئی۔ بلکہ بعض

لوگ تو یہ بھول ہی گئے کہ ایت وارکب پڑتا ہے۔ قاعدہ کی رو سے کام سے غیر حاضری کی سزا بڑی سخت تھی اور خاص طور پر گرجا جانے کے لئے چھٹی کا ملنا ناممکن تھا۔ لیکن جب کبھی کوئی تہوار آجاتا۔ تو پھر حکومت بھی مانع نہ ہوتی۔ اور لوگ بڑی تعداد میں گرجوں میں جاتے۔

## مشترکہ کاشتکاری کے ذریعہ مذہب کو مٹانے کی کوشش

دوسری تدبیر جس کا اثر مذہب پر پڑا وہ مجموعی مشترکہ کاشت کاری کے طریقہ عمل سے متعلق ہے حکومت نے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو ملا کر وسیع پیمانہ پر مشینوں کے ذریعے سے زراعت کا کام شروع کر دیا۔

ان مشترکہ کھیتوں میں کام کرنے والے کثرتِ رائے سے جب یہ فیصلہ کر دیتے کہ ہمیں گرجے کی ضرورت نہیں تو وہ گرجا بند کر دیا جاتا۔ عام طور پر یہ رائیں اس طرح لی جاتیں کہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے اور ہاتھ اُٹھا کر تائید یا مخالفت کر دی جاتی۔ شروع شروع میں بعض سرگرم کارکنوں نے جو بیشتر دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ زبردستی گرجے بند کر دیئے۔ اس کا اثر اچھا نہ پڑا۔ اور "منکرین خدا" کی جماعت کے صدر کو اس اقدام کے خلاف احتجاج کرنا پڑا۔ اب مشترکہ کھیتوں میں سرے سے یہ سوال ہی نہ رہا کہ کون صاحب گرجا جانا چاہتے ہیں۔ اور کون صاحب اس کے خلاف ہیں۔ یہاں تو یہ معاملہ تھا۔ کہ مشترکہ کھیت میں کام کرنے والی برادری مجموعی طور پر گرجے کو برقرار رکھنے کی حامی ہے یا اسے کلب اور دارالمطالعہ بنانے کے حق میں ہے۔ گرجوں کو

بند کرنے کا یہ طریق زبردستی بند کرنے سے آسان تھا۔ زبردستی بند کرنے میں تو بعض دفعہ خون خرابہ تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ بلکہ پادریوں نے بعض بااثر زمینداروں کی مدد سے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس کی بنا پر اُن پر الزام لگایا گیا۔ کہ وہ مساوات اور آخرت کا درس محبت دے کر طبقاتی جنگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ گرجے جو اَب تک کسی نہ کسی طرح زمانے کی ٹھوکروں کے باوجود برقرار تھے۔ اس یلغار میں وہ بھی نہ بچ سکے۔

## خلاف مذہب جدوجہد کا اُلٹا ردِّ عمل

مذہب کے خلاف اس محاذ کے زیرِ اثر قصبوں میں گرجے پر گرجے بند ہونے لگے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو گرجے بچ گئے تھے۔ ان میں عبادت گزاروں کی زیادہ بھیڑ رہنے لگی۔ اور خاص طور پر کرسمس اور ایسٹر کے موقع پر روسی عوام کا گرجوں میں اتنا ہجوم ہوتا کہ سوویٹ روس میں شاید ہی کوئی اس سے پُراثر منظر دیکھنے میں آئے کتاب "روس" کا مصنّف "برنارڈ پرس" لکھتا ہے۔

"جس زمانے میں مَیں روس میں تھا۔ میں نے ایک بہت بڑے گرجے میں عبادت گزاروں کی اتنی بھیڑ دیکھی۔ جتنی یہاں ہمارے ہاں انگلستان میں کسی میچ کے فائنل میں ہوتی ہے۔ لوگ ہال میں یوں بھرے ہوئے تھے۔ کہ گرجے کے خدّام کے لئے نذرانوں کو

جمع کرنا مشکل ہو رہا تھا اس اژدہام میں عبادت گزاروں کے خلوص اور عقیدت کا منظر اتنا مؤثر تھا کہ آدمی ایک دفعہ دیکھ لے تو کبھی نہ بھولے۔ مجمع میں جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ اور دونوں آپس میں گھلے ملے بیٹھے تھے۔ جتنی تعداد گرجے کے اندر تھی۔ اُسی قدر باہر اس انتظار میں کھڑی تھی کہ یہ فارغ ہوں۔ تو وہ عبادت کرے۔ ان کو تقریباً دو گھنٹے تک اپنی باری کے لئے انتظار کرنا پڑا۔"

مذہب اور لامذہبیت کی اس کش مکش کا پادریوں کی جماعت پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔ اب مذہبی بننے سے سرکار کی نظروں میں سُرخروئی نہ ہوتی اور نہ اس کی وجہ سے عہدے ملتے اور نہ وظیفے اور نہ بڑی بڑی مجلسوں میں اس سے بار ملتا، نہ امیر اور نواب سرِ تسلیم خم کرتے۔ اب مذہبی وہ بنتا ہے جس کے دِل کو لگی ہوتی ہے۔ اور اس کو اپنے عقیدہ پر پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ اس لئے مانتا ہے کہ اس کا دِل اسے مجبُور کرتا ہے اور ظاہر ہے جب کوئی اس طرح کسی مذہب کو مانے تو اس میں خلوص ہوگا۔ ایثار کا جذبہ ہوگا اور وہ اپنے عقیدے اور اصول کے لئے مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرے گا۔

اشتراکیت کی اس ابتلا نے روسی عیسائیت کے کھرے کھوٹے میں تمیز پیدا کردی ہے۔ اوپر اوپر کی جو جھاگ تھی وہ تو ختم ہوگئی اور جس میں انسانیت کا بھلا تھا۔ وہ اب بھی باقی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

سب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ شہروں سے کہیں زیادہ دیہات میں

مذہب سے وابستگی ہے لیکن گرجوں کے بند ہو جانے سے عبادت گزاری کے لئے دُور دراز جانا مشکل ہو گیا ہے۔ ایک مصنّف نے دیہات کے پادریوں کی دردناک حالت کا نقشہ بڑے مؤثر الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ پادری تکلیفوں اور مصیبتوں کے باوجود اب تک یہ لَو لگائے ہوئے ہیں کہ آخرکار عیسیٰ مسیح ان کی مدد کو آئے گا۔ اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے محض ان کے ایمان اور صبر کا امتحان ہے۔

## رُوسی عوام اب تک سخت مذہبی ہیں

۱۹۴۰ء میں رُوس اور فن لینڈ کی جنگ کے دوران میں بعض سُرخ سپاہی ایک جلاوطن رُوسی پادری کے سامنے پیش کئے گئے۔ سوال و جواب کے بعد پادری موصوف جس نتیجہ پر پہنچا وہ بجنسہٖ وہی تھا جس کا اعتراف روس کی "منکرین خدا" کی جماعت کے صدر نے کیا تھا۔ کہ مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دینے کے باوجود رُوسی کسان کی زندگی میں مذہب اب تک ایک زندہ اور مؤثر عنصر ہے اور یہ کہ لوگوں کو لامذہب بنانے کی ساری کوششیں ناکام ہوئی ہیں۔

کچھ بھی ہو دراصل بات یہ ہے کہ روسی اپنی افتاد سے سخت قسم کے مذہبی واقع ہوئے ہیں۔ اور اُن کی لامذہبیت میں بھی اتنی شدّت اور وثوق ہے کہ وہ بھی مذہب کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اَن گھڑ اور غیر مہذب طبائع کی جب کسی سے ٹھن جائے تو جوشِ جنوں

ہیں وہ عجیب عجیب بے جوڑ اور اوچھ حرکتیں کرگزرتے ہیں۔ اس قسم کے سنکی پن کے نمونے آپ کو ماسکو کے خلاف مذہب عجائب خانہ میں نظر آئیں گے۔ یہ سب صحیح لیکن ایک چیز جس کو رُوسی کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ اس کی خیال پرستی اور کسی بلند نصب العین سے وابستگی ہے۔ کچھ بھی ہو اگر روسی خیال پرست نہیں تو وہ روسی نہیں۔ عملی زندگی میں اس ذہنیت کی مثال ملاحظہ ہو۔

"سرجس ملگاکو" روس میں مارکسزم کے ابتدائی مبلغین میں سے تھا۔ بعد میں اسے ماسکو کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں معاشیات کا پروفیسر بنا دیا گیا تھا۔ کچھ حالات ایسے ہوئے کہ سرجس کے عقائد میں انقلاب آگیا اور بعینہٖ سینٹ پال کی طرح اس کی کایا پلٹ گئی۔ اور وہ پادری بن گیا اشتراکی حکومت نے اسے جلا وطن کر دیا۔ وہ آج کل پیرس کی ایک مذہبی درس گاہ میں دینیات کا پروفیسر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں سرجس موصوف نے ایک کتاب کے دیباچہ میں "روس میں مذہب کے مبلّغین" کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اشتراکیوں کو "اس زمین پر خدا کی بادشاہت" قائم کرنے کی دُھن لگی ہوئی ہے۔ اور ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ آگے چل کر ان کی یہ کوششیں خدا کی نظروں میں ناپسندیدہ ہوں گی اور اس سے کسی قسم کی شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے گی۔ یہ اشتراکی حضرت عیسٰی مسیح کو کبھی ختم نہ کر پائیں گے۔ ان کا مسیح کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ یہودیوں نے اسے صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ اگر مسیح صلیب پر نہ چڑھتے تو انہیں بقائے

دوام کیسے ملتا - اسی طرح روسی عیسائیت کو بھی موت وحیات کی کش مکش میں سے گزرنا ہوگا - چنانچہ روس میں آج کل پھر حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا جارہا ہے - لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عیسائیت کو وہاں نئی زندگی ملے گی - ہر واقعہ صلیب کے بعد عیسائیت پھر زندہ ہوتی ہے -

## لَا سے اِلّا کی طرف رجوع

روس میں مذہب کے خلاف اشتراکیوں کی جدوجہد اب ٹھنڈی پڑ گئی ہے - بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اب مذہب کی تخریب کا دور گزر چکا - اور اشتراکی شاید لَا سے اِلّا کی طرف آئیں گے - مذہب کا وہ حصہ جس کو مٹنا چاہیئے تھا اس بیس سال کی یلغار میں وہ تقریباً ختم ہو گیا - اب جتنا مذہب بچ رہا ہے وہ ایسا نہیں کہ کسی کے مٹائے مٹ سکے اس مذہب کا تعلق انسان کے اصل سرچشمہ زندگی سے ہے - یہ اتنا ہی ابدی اور دائمی ہے جس قدر خود انسان کی زندگی -

سچّا مذہب زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین اور ایک شاہراہ عمل دیتا ہے - اعلیٰ نصب العین کو ایمان کہہ لیجئے اور شاہراہ عمل کو نیک کاموں کا راستہ لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے مذہب کے نام لیوا نصب العین اور شاہراہ عمل دونوں کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں - اور ان کے نزدیک مذہب کا سارا مقصد اپنی اغراض کا حاصل کرنا رہ جاتا ہے - اس وقت مذہب کو تنقیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تنقیہ اتنا ہی سخت ہوتی ہے جس قدر عوارض سخت ہوں - یہ تنقیہ

کا عمل شروع سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اشتراکیت بھی، ممکن ہے
اسی قسم کا تنقیہ ہو اور اس کے طفیل مذہب الائشوں سے پاک ہو کر پھر
کندن بن کر دنیا کے سامنے آسکے۔ اگر سچّا مذہب واقعی فطرت کا
دین ہے تو جب تک فطرت کو دوام ہے سچّا مذہب بھی باقی رہے گا۔

محمد ولایت علی خاں

# اقبالؒ کا سیاسی پس منظر

دسمبر ۱۹۴۲ء کی شام بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں میں نے ایک سنگین چبوترہ نما قبر دیکھی تھی۔ میرے ساتھیوں نے کہا —— یہاں اقبالؔ ابدی نیند سو رہا ہے —— یہ بات بجائے خود صحیح ہو تو ہو میں اس کی صحت پر شبہ کرتا ہوں۔ اقبال کی قبر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میں ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ اقبال نہ تو مر سکا اور نہ اقبال ابدی نیند سو رہا ہے —— اقبال تو آج بھی زندہ ہے —— اقبال تو آج بھی جاگ رہا ہے۔ اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہہ خاک نہیں ہے

اقبال ایک بالائے خاک ہستی ۔ ہے

اقبال ایک زندہ جاوید ہستی ہے

اور آج ہم اسی "اقبال" کی حیات جاوداں کی گیارھویں سالگرہ منانے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ بظاہر تو اقبال کا جسم ہمیں یہاں نظر نہیں آتا۔ مگر کیا ہم اقبال کے اس وجود سے نظریں ہٹا سکتے ہیں جو آج اس وقت بھی ہمارے شبستان وجود کو اپنی نوائے جگر گداخت کا سوز عطا کر رہا ہے ـــــ؟

اقبال کی جب وفات ہوگئی تو اس وقت سارا ہندوستان رونے لگا کہ اب دوسرا اقبال کبھی نہ پیدا ہوگا۔ مگر میں پوچھوں کہ اب دنیا کو دوسرے اقبال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جبکہ اقبال ایک کبھی نہ مرنے والی اور کبھی نہ فنا ہونے والی ہستی ہے۔ جاوید منزل میو روڈ لاہور میں رہنے والا اقبال تو مر سکتا ہے مگر وہ اقبال جو پیام مشرق ہے، اسرار و رموز ہے۔ جو "ارمغانِ حجاز" ہے۔ جو "بالِ جبریل" ہے جو "بانگِ درا" ہے وہ اقبال ـــــ وہ اقبال کبھی مر سکتا ہے؟ اس اقبال کا سورج کبھی غروب ہو سکتا ہے؟؟

اقبال کون تھا ـــــ؟ اقبال کے بارے میں بڑی متضاد رائیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اقبال ایک شاعر تھا۔ کسی کا خیال ہے کہ اقبال ایک فلسفی تھا اور کوئی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اقبال ایک پیغمبر تھا۔ مگر اقبال نہ تو ایک پیغمبر تھا۔ نہ شاعر نہ فلسفی ـــــ بلکہ وہ تو ایک مرد "خود آگاہ" تھا ـــــ اور یہی اقبال کا پہلا تعارف ہے۔

یوں تو اردو اور فارسی ادب میں اقبال کا نام ہمیں شاعروں کی صف میں نظر آتا ہے۔ مگر اقبال کو شائد خود اپنے شاعر ہونے میں تامل تھا۔ چنانچہ فارسی

ادب کے نقادوں سے وہ یوں خطاب کرتا ہے کہ

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اس طرح اُردو ادب کے ناقدین سے وہ یوں خطاب کرتا ہے ۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز درونِ میخانہ

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اقبال کی طرح خود مجھے بھی اقبال کو ایک شاعر ماننے میں تامل ہے، کیونکہ اقبال کا مقام ایک شاعر کے مقام سے کہیں زیادہ بلند ہے ۔ یا پھر اگر اقبال واقعی ایک شاعر تھا تو میں بلاخوف البطال یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری اقبال پر ختم ہو گئی ۔

اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہندوستان کی منظوم سیاسی تاریخ پڑھ رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ میں بادشاہوں حکومتوں اور لڑائیوں کے تذکرے پڑھنے کے بعد اقبال کے کلام کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہو جاتا ہے ۔ ورنہ پھر ہندوستان کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے ۔ ہماری سیاسی تاریخ میں اس کا تو ذکر ہے کہ ماضی میں کیا کچھ ہوا مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ہمارا حال اور مستقبل کیا ہے ۔ اور کیا ہو گا ؟ یہ ذکر ہمیں اقبال کے کلام میں ملتا ہے ۔ اور اسی لئے میں اقبال کو ہندوستانی تاریخ

کے مستقبل کا مؤرخ سمجھتا ہوں۔ مستقبل کی تاریخ کی تدوین کے لئے اقبال کا کا کلام ایک خاکہ ہے۔ چنانچہ ثبوت کی خاطر میں یہ عرض کروں گا کہ اقبال کے کلام میں ہمیں وہ پاکستان نظر آتا ہے جو آج ایک جغرافیائی حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

آج پاکستان کی سرزمین کو اس اعزاز پر بڑا ناز ہے کہ اقبال کا مزار پاکستان میں ہے مگر اقبال نہ تو پاکستانی تھا اور نہ ہندوستانی اقبال نہ تو ایشیا کی ملک ہے اور نہ مشرق کی بلکہ اقبال ساری کائنات کی ملکیت ہے۔ اقبال ایک آفاقی شاعر ہے، نہ وہ شاعرِ مشرق ہے اور نہ شاعرِ ملت، بلکہ وہ شاعرِ انسانیت ہے۔

اقبال کے شعر جب پہلی بار سرزمین ہمالہ کی فضاؤں میں گونجے تو اس وقت ہندوستان نے بڑی مشکوک نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ لاہور کا وہ مشاعرہ جس کے صدر مرزا ارشد گورگانی تھے۔ اور جس مشاعرے میں اقبال نے پہلی مرتبہ شرکت کی تھی۔ اس مشاعرے سے اقبال کے شاعر ہونے اور ایک آفاقی شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال نے اس مشاعرے میں اپنی نظم کا یہ آخری شعر پڑھا تھا ؎

ہم کو تو نہ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
اقبال ہم اسیر ہیں زلفِ کمال کے

اقبال کی پہلی پبلک نظم کے اس آخری شعر سے اقبال کی آفاقی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد جب اقبال کا یہ شعر فضا میں بلند ہوا

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تو اس وقت سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ ہر طرف سے اقبال پر بڑی لے

دے ہونے لگی وہ دَور ہندوستانی تاریخ میں قومیت کا دَور کہا جاتا تھا۔ اس لئے اقبال کے اس ترانہ ملّی کو فرقہ وار ذہنیت کا آفریدہ سمجھا جاتا رہا۔ عام لوگوں کے اعتراضات سے قطع نظر خود مولانا محمد علیؒ نے ترانہ ملّی پر ۹ اگست ۱۹۲۷ء کے اخبار ہمدرد میں اداریہ لکھا۔

"چین انگریزوں کا ہے یا امریکیوں کا جاپانیوں کا یا پھر چینیوں کا (جن میں مسلمانوں کا اچھا خاصا عنصر ہے) مگر وہ چین آج یقیناً ہمارا نہیں ہے — اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں کا یا یہودیوں یا نجدیوں کا لیکن جہاں حضرت خدیجہ کا مکان شہید کر دیا جائے اور اس میں بول و براز کیا جائے اور جب اس کی شکایت کی جائے تو اقبال کے ہم وطن بھائی مسٹر اسماعیل غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے فرمائیں کہ کیا خدیجہ خود وہاں بول و براز نہیں کرتی تھیں جہاں مولدِ رسول اللہ کو بھی شہید کر دیا جائے اور جہاں اُمہات المومنین اور اہلِ بیت کی قبروں کے نشان تک نہ چھوڑے جائیں۔ جہاں کی مسجد شہید کر دی جائے، اور ہم اس کے لئے کچھ نہ کر سکیں وہ عرب ہمارا نہیں ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر کے علاوہ ایک اور نقاد کا ایک اعتراض قابلِ توجہ ہے وہ کہتا ہے:

"اقبال کا نظریہ زندگی لاجواب ہے لیکن ان کا نظریہ ملت بہت غلط اور ضرر رساں ہے۔ وہ جن بلندیوں پر انسان کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہاں مسلمان اور غیر مسلمان سبھی کو پہنچنا ہے اور بغیر مذہب کے پہنچنا ہے۔"

اس نقاد کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک شاعر بھی نظر آتا ہے جس نے اقبال کو ایک فرقہ پرست شاعر قرار دے کر ایک نظم بھی کہی تھی۔ اس نے اقبال سے راست خطاب کیا تھا۔ چند شعر یہ ہیں :

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمین سے سلوک تیرا مخاصمانہ
تو فخر ہندوستاں نہیں ہے تو شاعر ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے فتنہ زا ہے بزنگِ اعجازِ شاعرانہ

نہیں معلوم ان اعتراضات کا اقبال پر کیا اثر مرتب ہوا تھا۔ اور اس نے کوئی جواب دیا تھا کہ نہیں —— مگر جہاں تک فرقہ واریت کے الزام کا تعلّق ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ اقبال کا مذہب اسلام ہے جس کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کو محض اسلامی شاعر یا صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھنا تنگ نظری ہے۔ یہ نہ صرف میرا ذاتی خیال ہے بلکہ اکثر فراخ دل غیر مسلم اصحاب کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ میں سر تیج بہادر سپرو کی وہ رائے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے مولوی عبدالحق کو رسالہ "اردو" کے اقبال نمبر کی ترتیب کے موقع پر لکھ کر بھیجی تھی۔

> اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت نا انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے فلسفۂ اسلامی، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے

آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالی داس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو محدود نہیں کیا اور نہ دوسرے مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدر دانی میں کمی کی۔ اگر اقبال اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں۔"

سر تیج بہادر سپرو کا یہ جواب اقبال پر فرقہ واریت کے الزام کی زوردار نفی کرتا ہے۔ مگر جہاں تک اقبال کی وطن دشمنی کے الزام کا تعلق ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ اقبال ہندوستانی نہیں تھا بلکہ اقبال ایک عالمگیر شخصیت تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ہندوستان سے محبت نہیں تھی۔ اسے ہندوستان سے عشق تھا۔ اور افلاطونی قسم کا عشق تھا۔ وہ صرف وطنیت کے تصوّر کے خلاف تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

"ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے"

وہ اقبال جو خدا سے بھی شوخی سے باز نہ رہ سکتا تھا وہ بھلا ان ارضی اور زمینی خداؤں کی بندگی کیسے گوارا کر لیتا۔ وہ رنگ و نسل اور جغرافیائی تقسیم کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اس کے سامنے کوئی مذہب یا کوئی وطن نہیں تھا۔ اس کے سامنے حدِ نگاہ تک اور حدِ نگاہ سے بھی دور پرے صرف انسان تھا۔ اس نے انسان کو اس مقام کا واضح طور پر پتہ دیا کہ

ے

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اقبال ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کے امتیاز کو بالکلیہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس لئے پہلی نظر میں ہمیں وہ غیر ہندوستانی نظر آتا ہے جو لاہور میں بیٹھ کر فلسطین و قرطبہ، نجد و حجاز کے قصیدے پڑھتا ہے۔ اقبال کو اس ہندوستان سے بلاشبہ نفرت تھی جو بدیسی سامراج کا غلام تھا۔ اس نے خدا سے بھی یہی شکوہ کیا تھا کہ اس دیس میں مجھ کو پیدا کیا جو غلام ہے اور جس دیس کے بندے بھی غلامی پر رضامند ہیں۔ ایک بار وہ اپنا اور گوئٹے کا مقابلہ کرتے ہوئے اسی افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ

او چمن زادہ چمن پروردۂ
من دمیدم از زمینِ مردۂ

بعض معترضین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اقبال نے بلادِ اسلامیہ اور یورپ کا سفر کیا تو اس کی رہی سہی ہندوستانیت بھی ختم ہو گئی۔

اقبال کا سفرِ یورپ ان کی شاعری کا تجرباتی دور ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کا سفر کرتے ہیں اور اس فرنگی شیشہ گر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جس نے ساری دنیا کو سامراجیت کا قمار خانہ بنا رکھا ہے۔ اقبال کی شاعری میں "فرنگی" کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اردو کی عشقیہ شاعری میں "شیخ جی" کو حاصل ہے۔ اقبال موجودہ انسانی زندگی کے ہر آزار کو، ہر لعنت کو، ہر نحوست کو فرنگی سامراج کی شرپسند ذہنیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرنگی تہذیب

نے اپنا پروپیگنڈا کچھ ایسے سلیقے سے کیا ہے کہ ایک عامی کی عقل دھوکا کھا جاتی ہے کہ دنیا نے یا انسان نے ترقی کی معراج دیکھ لی ہے۔ خوبصورت شہروں جگمگاتی دکانوں، اونچے اونچے مکانوں، رنگ برنگے لباسوں کو دیکھ کر انسان کی پہلی نظر یقیناً خیرہ ہو جاتی ہے۔ مگر اقبال نے یورپ میں قدم رکھنے کے بعد فرنگی سامراج کو سمجھنے کے بعد اپنے آپ کو سمجھایا۔

گرچہ بہت ہے دلکشا حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند و بال دانہ و دام سے گزر

ہندوستان کی جدید معاشرت میں یورپ کا سفر اقبال کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عام ہندوستانی جب یورپ جاتے ہیں۔ اور یورپ سے واپس آتے ہیں اور اپنا بڑا دلچسپ رنگین سفر نامہ لکھتے ہیں۔ یورپ کی عمارتوں، جھیلوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے علاوہ وہاں کی عورتوں کی تصویروں کو بطور یادگار اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ گفتگو میں رہن سہن میں ہر جگہ یورپ کی تہذیب، یورپ کی سیاست۔ یورپ کی معاشرت کا حوالہ دیتے ہیں اور بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر اقبال کچھ عجیب "رجعت پسند" تھے۔ انہوں نے کوئی رنگین سفر نامہ نہیں لکھا۔ انہوں نے برف کے کسی گلیشر پر کھڑے ہو کر یا کسی سوئمنگ پول پر کسی نیم عریاں لعبت فرنگی کے ساتھ کوئی تصویر نہیں کھنچوائی، کسی مادام کے ساتھ بال روم میں رقص نہیں کیا۔ بجلی کے چراغوں کی بُراقی سے ان کی آنکھیں نہیں چندھیائیں —— عام ہندوستانی کو یورپ چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے مگر اقبال تو بہت جلد یورپ سے اُکتا گئے۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے

اپنی وحشتِ دل کا اس طرح اظہار کیا۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں جز از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

جمہوریت کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو یقیناً آپ کو بھی اقبال کا ہمنوا ہونا پڑے گا۔ دنیا میں آج تک صحیح جمہوریت کہیں قائم نہ ہو سکی۔ جو جمہوریت ہمیں نظر آتی ہے وہ سرمایہ داری کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور سرمایہ داری استبدادیت کا دوسرا نام ہے۔

موجودہ جمہوریت میں ہمیشہ کم پڑھا لکھا اور زیادہ متمول طبقہ برسرِ اقتدار آتا ہے جس کے نتائج کو دیکھ کر اقبال نے کہا ہے:

گریز از طرزِ جمہوری غلامے پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آئید

موجودہ جمہوریت جو تہذیب، ثقافت، تعلیم اور تمدّن معرضِ وجود میں لاتی ہے وہ نہایت ادنیٰ اور ناقص درجے کی ہوتی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ مغزِ دو صد خر ہے۔ اقبال نے جمہوریت کی بڑی اچھی تعریف کی ہے۔

اس راز کو ایک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور جگہ اقبال نے مسولینی کی نطق سے جمہوریت اور ان کی آمریت کے فرق کو یوں واضح کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہوئے
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوب ملّے کی آبیاری میں رہے
تم نے تو دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑے بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

ملوکیت، شہنشاہیت، آمریت یہ سب سرمائے کے نشے ہیں۔ اس نشے کے لئے اقبال یہ ترشی تجویز کرتے ہیں۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ اُمم کا یہ پیغام ازلی ہے
صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک

سرمایہ داری جمہوریت کی آڑ لے کر جس زبوں مساوات کا پرچار کرتی ہے اس پر اقبال یہ طنز فرماتا ہے۔

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ سیاست
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

شائد اسی خون آشام سیاست سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ اور خدا سے عرض کرتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

سامراجی جمہوریت، ملوکیت، شہنشاہیت، آمریت اور اسی نوع کے ہر نظام حکومت پر اقبال نے یوں تو بہت کچھ کہا ہے لیکن طوالت سے گریز کی خاطر میں اس کے صرف دو شعر یہاں پیش کرتا ہوں جن میں اقبال نے ان سیاسی نظامات کے اصلی خد و خال بے نقاب کئے ہیں۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی اگر محکوم
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اسی لئے اقبال ان تمام سیاسی تحریکات سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اب وہ گویا قید مکاں سے بھی آزاد ہو کر ایک آفاقی شاعر ہو جاتا ہے۔ وہی اقبال جو "ترانہ ہندی" گاتا تھا، وطنیت کی بدصورتی دیکھ کر اپنے پچھلے نظریہ وطنیت کو یوں باطل کرتا ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہان نہ سمرقند

مغربی جمہوریت اور مشینی تہذیب میں یورپ کو یوں مسموم ہوتا دیکھ کر وہ کہتا ہے:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس بدنیت کی رہ سکی نہ غضیف

اس لئے وہ بہت جلد شبستان یورپ سے بیزار ہو جاتا ہے۔

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایانِ تجلّی

ایک اور جگہ اسی بہشت شداد یعنی یورپ کا حال لینن کی زبان سے خدا کے

حضور میں عرض کرتا ہے :

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق نہیں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات

اسی اثنا میں ۱۹۱۷ء میں روس میں "سُرخ انقلاب" ظہور پذیر ہوتا ہے۔ سُرخ پرچم جو زار کی استبدادیت کا خونی کفن ہے فضا میں لہراتا ہے۔ بندۂ مزدور دُنیا کے چھٹے حصّے پر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ یہاں اقبال سوویت روس کے سُرخ انسانوں کا ہمنوا ہو کر ساری دنیا کو ایک پیغام دیتا ہے۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

نسلِ قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر سنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کے اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

سُرخ انقلاب کی ہواؤں کی لائی ہوئی بہار انسانیت سے وہ خوش ہو کر گنگناتا ہے:

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

جہاں تک امتیاز رنگ و نسل، جغرافیائی تفریقات، آقائیت اور محکومی، کلیسی و فرعونی، فسطائیت، بولہبی، مزدور اور سرمایہ دار کے تنازعات کا تعلق ہے اقبال کا رویّہ اشتراکیت سے ہر جگہ ہمدردانہ رہا ہے۔ وہ معاشی مساوات کا سختی سے قائل ہے لیکن جہاں وہ اشتراکیت سے جُدا ہوتا ہے۔ وہ منزل یہ کہ وہ ذاتی ملکیت یا پرائیویٹ پراپرٹی کا مخالف نہیں دیسے ایک بار وہ علانیہ طور پر اس کا اعتراف کرتا ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی گفتار

اقبال کو زمانے نے مہلت نہ دی ۔ اس کی عمر نے اس سے وفا نہیں کی۔ اقبال کو اپنی شاعری کی آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے موت آگئی اور یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں کو اس کی شاعری میں بڑا تضاد اور بے راہ روی نظر آتی ہے۔

اس پر اعتراضات و الزامات سے قطع نظر اقبال کا عطا کردہ شاہینی تجسّس اس کا عشق براہیمی، اس کی نگاہ قلندرانہ، اس حرارت مجاہدانہ، اس کی طبیعت خطر پسند، اس کا نالۂ شبگیر، اس کی آہِ سحرگاہی، اس کا فقر ملوکانہ، اس کے خیال و نظر کی مجذوبی، نئی دنیا کے انسان کو زندگی کے جو صحیح آداب سکھا رہی ہے اس کے لئے انسانیت آخری غروب آفتاب تک اس کی ممنون رہے گی۔

آج انسانیت کا، پاکستان کا محسن ہم میں نہیں ہے۔ بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ابدی نیند سو رہا ہے۔ اور اس کی قبر پاکستان کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے۔ اور اس کا کلام پاکستان کی روح ہے۔

امروز ۲۲ر اپریل ۱۹۴۹ء

مشفق خواجہ

# اقبال پرستی سے
# اقبال شناسی تک

علامہ اقبال کے بارے میں اردو اور دوسری زبانوں میں اب تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن "اقبال پرستی" کی حد سے نکل کر ہم جب "اقبال شناسی" کی منزل پر پہنچتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو ہمیں اقبال کے بارے میں ابتدائی اور بنیادی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں اور اقبال کی زندگی کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ اقبال کی کوئی ایسی سوانح عمری موجود نہیں ہے جس میں پیدائش سے وفات تک کی ضروری تفصیلات موجود ہوں۔ تقریباً ہر سوانح نگار نے اصل مآخذ کی طرف رجوع کئے بغیر ثانوی حوالوں کو بنیاد بنا کر اقبال کی ایسی تصویر پیش کی ہے جسے کسی طرح بھی "اصل کے مطابق" نہیں کہا جا سکتا اور تو اور مولانا عبدالمجید سالک صاحب بزم کے ایک اہم رکن تھے اور علامہ سے ان کے مراسم بہت گہرے تھے۔

نیز حیات اقبال سے متعلق تمام مواد بھی ان کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ علامہ اقبال کی ایک جامع اور مستند سوانح عمری مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے تمام بنیادی مواد جمع کیا جائے۔ یہ کام خاصا وقت طلب ہے، لیکن بعض ایسے اداروں کی موجودگی میں جو اقبال کے نام سے منسوب ہیں یہ کام بہت عمدگی سے انجام پا سکتا ہے۔ ذیل میں بعض ایسے امور کی تفصیل دی جاتی ہے جن پر توجہ دیئے بغیر "اقبال شناسی" کا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔

**ملفوظات** : اقبال کا زمانہ کوئی بہت دُور کا نہیں ہے۔ اس وقت برصغیر ہندو پاک میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال سے تعلق رہا ہے اقبال کے بعض بے تکلف احباب بھی خوش قسمتی سے ہمارے درمیان موجود ہیں، ایسے تمام حضرات کی یادداشتوں کا محفوظ ہو جانا نہایت ضروری ہے یہ توقع رکھنا کہ یہ حضرات از خود اس کو انجام دیں گے، کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کو خود اس بات کا خیال ہوتا تو یہ کام اب تک مکمل ہو چکا ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام حضرات سے رابطہ پیدا کیا جائے اور سوالنامے مرتب کر کے ان سے شخصی ملاقاتوں کے ذریعے تمام معلومات حاصل کی جائیں "ملفوظات اقبال" (مرتبہ۔ محمود نظامی) اِس قسم کی ایک کامیاب کوشش تھی، لیکن اس میں بھی بیشتر لکھنے والوں نے اجمال سے کام لیا ہے اور سالہا سال کے نقوش و تاثرات کو چند صفحات میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ "ملفوظات" کے مضمون نگاروں میں جو حضرات بقیدِ حیات ہیں، انہیں بھی اپنی یادداشتیں از سرِ نو مرتب کرنے کی دعوت دینی چاہیئے۔ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت سے ایسے لوگ انتقال کر چکے ہیں جو اقبال کے بارے میں

بہت کچھ جانتے تھے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں ان کی موت کا انتظار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقبال کے بارے میں بہت سی معلومات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پردۂ خفا میں رہیں گی۔

**مکاتیب اقبال :** اقبال کی سوانح حیات کے لئے دوسرا ذریعہ مکتوبات ہیں۔ اقبال کے مکتوبات کے تقریباً نصف درجن مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے خطوط مختلف اخبارات و رسائل میں دفن ہیں نیز غیر مطبوعہ خطوط کی ایک بڑی تعداد بھی بعض لوگوں کے پاس موجود ہے۔ اقبال کے تمام خطوط کو ایک جگہ جمع کرنا ضروری ہے۔ مکتوبات کا ایک ایسا ایڈیشن شائع کرنا چاہیئے جس میں تمام خطوط کو تاریخ وار درج کیا جائے۔ مکتوب الیہم کے بارے میں ضروری معلومات دی جائیں اور وضاحت طلب امور پر اہل لوگوں سے حواشی لکھوائے جائیں ان مکاتیب کا موضوع وار اشاریہ مرتب کرنا بھی ضروری ہے جس سے ایک ہی نظر میں یہ معلوم ہو سکے کہ اقبال نے مختلف مسائل کے بارے میں کیا کچھ لکھا ہے۔

**مکتوبات بنام اقبال :** جن لوگوں سے اقبال کی خط و کتابت رہی ان میں سے بعض مشاہیر کے خطوط بنام اقبال شائع ہو چکے ہیں، تحقیق و تلاش سے اقبال کے نام اور بہت سے لوگوں کے خطوط بھی مل سکتے ہیں، مجوزہ مجموعہ مکاتیب اقبال کے ضمیمے کے طور پر "مکتوبات بنام اقبال" کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا جا سکتا ہے جس سے حیات اقبال کی بہت سی گم شدہ کڑیوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

**اقبال کا متروک کلام :** اقبال کا بہت سا کلام ایسا ہے جو انہوں نے بعض وجوہ کی بنا پر اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس قسم کے کلام کے چار

مجموعے "رخت سفر"۔ "سرود رفتہ"۔ "باقیات اقبال" اور "تبرکات اقبال" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ روزگار فقیر جلد دوم میں بھی بہت سا متروک کلام شامل ہے۔ خیال ہے کہ مزید تحقیق سے اقبال کا اور کلام بھی مل سکتا ہے۔ اس تمام متروک کلام کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنا چاہیئے۔ اقبال کے مروجہ مجموعہ ہائے کلام میں ترمیم و اصلاح کا عمل بھی ہوا ہے۔ متروک کلام میں ایسے تمام اشعار کے ابتدائی متون درج کر کے ان کے ساتھ اصلاح شدہ متون بھی درج کرنے چاہئیں تاکہ کلام اقبال میں اصلاح و ترمیم کی نوعیت معلوم ہو سکے۔

**مضامین اقبال:** اقبال کے مضامین و مقالات کے مندرجہ ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ مضامین اقبال از تصدق حسین تاج - ۲۔ مقالات اقبال از عبدالواحد معینی

ان دونوں مجموعوں میں بیشتر مضامین مشترک ہیں، دوسرے مجموعے میں اگرچہ بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ تاہم ابھی اقبال کے مضامین کی ایک اچھی خاصی تعداد مختلف اخبارات اور رسائل کی ورق گردانی سے مل سکتی ہے۔ اقبال کے انگریزی اور اردو مقالات کے دو مجموعے مرتب کرنے چاہئیں جن میں تمام مضامین، خطبات، تقاریر اور دیباچوں اور اسی نوعیت کی دوسری تحریروں کو یکجا کر دینا چاہیئے۔

**اقبال کے فراموش شدہ علمی کارنامے:** بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال نے ۲-۱۹۰۱ء میں مندرجہ کتابوں کے تلخیص و ترجمہ کا کام کیا تھا۔

(۱) پولیٹیکل اکانومی، از واکر (۲) EALY PLANTAGENETS از اسٹب۔

معلوم نہیں یہ مسودے کہاں ہیں؟ اس طرح اقبال نے اپنے زمانہ طالب علمی میں

یقیناً اور بھی اس نوعیت کے کام کئے ہوں گے، ان سب کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ اس قسم کے مسودوں کو تلاش کر کے چھاپنا چاہیئے تاکہ اقبال کی ابتدائی علمی فتوحات کا اندازہ ہو سکے۔ اس طرح اقبال کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

**کلام اقبال کی تاریخی تدوین :** کلام اقبال کے مروّج مجموعوں اور متروک کلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کرنا چاہیئے جس میں تمام کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کیا جائے۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے، مختلف اخبارات اور رسائل اور مکتوباتِ اقبال کی مدد سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کام میں اگر کوئی رکاوٹ ہو سکتی ہے تو وہ کاپی رائٹ کی مشکل ہے۔ لیکن کام کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اقبال کے وارثوں کو اس کی اجازت دینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کام کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اقبال کا تمام کلام ایک ہی مجموعے میں مل جائے گا۔

**تذکرہ احباب و اساتذہ :** اقبال کے اساتذہ کا جب ذکر آتا ہے تو صرف دو نام ذہن میں آتے ہیں ایک مولوی سید میر حسن کا اور دوسرا پروفیسر آرنلڈ کا۔ حالانکہ اقبال نے (سیالکوٹ، لاہور اور یورپ میں) کم و بیش دو درجن اہلِ علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ "اساتذہ اقبال" کے نام سے ان اہل علم کا تذکرہ مرتب کیا جانا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اقبال نے کن کن حضرات سے علم حاصل کیا۔ تحصیل علم کی نوعیت کیا تھی۔ اور ان اساتذہ نے اقبال کی شخصیت کو بنانے سنوارنے میں کس قدر حصّہ لیا۔

اسی طرح اقبال کے احباب کا تذکرہ بھی مرتب کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ لاہور کے قیام کے ابتدائی زمانے کے دوستوں کا ذکر حکیم احمد شجاع نے "خون بہا" میں

کیا ہے لیکن صرف نام گنوائے ہیں، زندگی کے مختلف ادوار میں جن لوگوں سے اقبال کے دوستانہ مراسم رہے، ان کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں، جو صرف نیازمند تھے یا جن کی شناسائی چند ملاقاتوں تک محدود تھی۔ احباب سے مراد وہ حضرات ہیں جو اقبال سے برابر کی سطح پر ملتے تھے۔ یہ احباب دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ جو خود مشاہیر میں شامل ہیں جیسے سر عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود، عطیہ فیضی وغیرہ اور دوسرے وہ جو بڑی حد تک غیر معروف ہیں مثلاً مولوی گلاب دین، مولوی الف دین، خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش وغیرہ۔

"مشاہیر احباب" کے حالات عام طور پر مل جاتے ہیں مگر غیر معروف احباب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ بعض کتابوں اور مضامین میں ان کے نام نظر آجاتے ہیں۔ اقبال کے احباب کا تذکرہ ایسا لکھا جانا چاہیئے جس میں تمام احباب کے حالات ہوں اور ان کے اقبال سے مراسم کی جملہ تفصیلات ہوں۔

**کتابیات اقبال**: اقبال سے متعلق تحریروں کی تین چار فہرستیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تازہ ترین اقبال اکیڈمی کی شائع کردہ ببلوگرافی ہے اس قسم کے کام کسی طرح بھی حرف آخر قرار نہیں دیئے جا سکتے اس لئے کہ اقبال پر ہر سال کثرت سے مضامین لکھے جاتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہر سال "کتابیات اقبال" کے نام سے اقبال سے متعلق تحریروں کی مفصل فہرست چھاپی جائے جس میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے مضامین کے بھی حوالے ہوں، اردو کی حد تک انجمن ترقی اردو گزشتہ چار سال سے یہ خدمت انجام

دے رہی ہے - لیکن صرف اردو مضامین کی فہرست مرتب کرنے سے اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا - یہ فہرست دو طریقوں سے مرتب کرنی چاہیئے ایک تو مصنف وار اور دوسرے موضوع وار تاکہ محققین کو اپنے مطلب کا مواد حاصل کرنے میں آسانی ہو -

**مطالعہ اقبال** : اقبال نے اپنے کلام اور دیگر تحریروں میں بے شمار مصنفوں اور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، کہیں کسی کی رائے کی تردید کی ہے، اور کہیں اپنے کسی بیان کی تائید میں کسی کی رائے کو پیش کیا ہے - بعض مصنفین سے اقبال نے اپنی بیزاری کا اور بعض سے انتہائی عقیدت کا اظہار کیا ہے -

یہ مصنف اور کتابیں متعدد زبانوں اور متعدد شعبہ ہائے علم سے تعلق رکھتی ہیں - "مطالعہ اقبال" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جانی چاہیئے جس میں ان تمام مصنفوں اور کتابوں کی تفصیلات حروف تہجی کے اعتبار سے درج کی جائیں جن کے حوالے اقبال نے دیئے ہیں - اور جن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، ہر مصنف اور کتاب کے بارے میں ضروری معلومات دینے کے ساتھ یہ بھی صراحت کی جائے کہ اقبال نے کہاں کہاں ان کا تذکرہ کیا ہے -

**نقد اقبال** : اقبال کے فلسفہ و فکر کے بارے میں ہزارہا مضامین لکھے جا چکے ہیں، ان میں سے بعض مقالات کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن بڑی تعداد ابھی رسائل و اخبارات میں دفن ہے - ان میں اچھے بُرے سبھی طرح کے مضامین ہیں - ان سب مضامین کو جمع کر کے ان میں سے اچھے اور معیاری مضامین انتخاب کر کے انہیں موضوع وار مجموعوں کی شکل میں چھاپنا چاہیئے - اس مقصد کے

لئے ایک مجلسِ ادارت کی تشکیل ضروری ہے۔ جو ایسے اصحاب علم پر مشتمل ہو جو اقبالیات پر درجہ استناد رکھتے ہوں۔ اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر کم از کم ایک درجن مجموعہ ہائے مقالات تیار ہو سکتے ہیں اس مجلس ادارت کو مستقل حیثیت دی جا سکتی ہے تاکہ ہر سال اقبال پر جو کچھ لکھا جائے وہ کتابی شکل میں محفوظ ہوتا رہے۔

**اقبال کا ذہنی ارتقاء:** ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی نے ایک طویل مقالہ "حالی کا ذہنی ارتقاء" کے نام سے لکھا ہے جس میں ۱۸۷۱ء سے لے کر آخری ایام تک کا ایک سن وار جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ حالی نے کس عمر میں اور کیسے حالات میں مختلف مسائل کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا۔ اقبال کے ذہنی ارتقاء کے سلسلے میں بھی ایک ایسا ہی جائزہ مرتب کرنا چاہیئے۔ اس کام سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو اقبال کے ذہنی ارتقاء کی عہد بہ عہد تفصیل تیار ہو جائے گی۔ اور دوسرے ان کی تمام تحریروں کی تاریخ تصنیف کی صراحت بھی ہو جائے گی۔ اقبال کی تمام تحریروں کا واقعاتی پس منظر بیان کر دینے سے یہ فائدہ بھی ہو گا کہ اقبال کے بارے میں بعض غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ مثلاً ۱۹۱۸ء میں اقبال نے "جنگ اور اہلِ ہند" کے نام سے ایک مسدّس لکھا تھا جس میں برطانوی حکومت کی بہت تعریف کی تھی، اہلِ ہند کو جنگ میں حصّہ لینے کی ترغیب دی تھی اور تخت شاہی کی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔ بعض لوگ اقبال کے اس مسدّس کو وطن دشمنی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان حالات کا تجزیہ کیا جائے جن میں یہ مسدّس لکھا گیا تھا تو اقبال بے قصور نظر آتے ہیں، اقبال کے ذہنی ارتقاء کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جب ۱۹۱۸ء کے تحت اس مسدّس کا ذکر آئے گا تو اس کا واقعاتی پس منظر بھی بیان کیا جائے گا،

جس سے یہ معلوم ہوگا کہ مسدّس کے تمام خیالات نواب ذوالفقار علی خاں کے ہیں ، اقبال کا تصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے ان خیالات کو منظوم کر دیا۔

**اشاریۂ کلام اقبال :** کلام اقبال میں بے شمار مسائل اور موضوعات پر اقبال نے اظہار خیال کیا ہے اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ کسی خاص مسئلہ پر اقبال نے کیا کہا ہے تو اسے اقبال کی جملہ تصانیف کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت طویل کام ہے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے "اشاریہ کلام اقبال" کی ترتیب نہایت ضروری ہے۔ جس میں کلام اقبال کی موضوع وار تفصیل دی جائے اور یہ بتایا جائے کہ مختلف موضوعات پر اقبال نے کہاں کہاں اظہارِ خیال کیا ہے۔

**ہم عصر اخبارات و رسائل کے مضامین :** اقبال کے بارے میں لکھنے کا آغاز ۲-۱۹۰۱ء سے ہو گیا تھا ان کی وفات تک مختلف اخبارات و رسائل میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مخالف و موافق دونوں طرح کی تحریروں کو محفوظ کر لینا چاہیئے۔ بعض روزناموں میں ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں، جن کا اقبال کی سیاسی زندگی سے گہرا تعلق تھا، ان تحریروں کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔ اقبال کے بعض سیاسی بیانات اور خطبات پر بے شمار اخباروں نے اداریئے لکھے، ان سب کو بھی جمع کر لینا چاہیئے۔ یہ کام بڑی محنت کا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کی جائے۔ یہ کام دو چار افراد کے کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے ایک پوری جماعت کی ضرورت ہے، ترقی اردو بورڈ کراچی نے جس طرح امثال کی فراہمی کے لئے مختلف اہلِ علم حضرات سے نیم رضاکارانہ طور پر خدمات حاصل کی ہیں، اسی طرح اقبال اکیڈمی کو بھی یہ کام انجام دینا چاہیئے۔ اس مقصد

کے لئے پاکستان سے زیادہ ہندوستان کی لائبریریاں مفید ہوں گی کیونکہ بہت کم اخباروں اور رسالوں کے مکمل فائل پاکستان کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

**آثار اقبال کا تحفظ:** اقبال کے مکاتیب اور مسودات وغیرہ مختلف اداروں اور افراد کے پاس محفوظ ہیں، ان آثار کا ایک حصہ اقبال اکاڈمی کراچی میں ہے، اقبال کی ذاتی لائبریری اسلامیہ کالج لاہور میں ہے، کچھ چیزیں مختلف عجائب گھروں کی ملکیت ہیں ابھی بہت سا ذخیرہ اقبال کے خاندان کے افراد اور دیگر نیازمندان اقبال کے پاس ہے۔ یہ سب آثار کسی ایک جگہ محفوظ کر لینے چاہئیں۔ ان کا منتشر حالت میں رہنا مناسب نہیں۔ خطوط اور مسودات کی بڑی تعداد مختلف حضرات کی ذاتی ملکیت ہے جس کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہے۔ مثلاً عطیہ بیگم فیضی کے پاس اقبالی نوادر کا بڑا ذخیرہ ہے، جن میں اقبال کے اصل خطوط، عطیہ کی ڈائری اور اقبال کی بعض نظموں کے مسودے ہیں۔ اقبال کی ایک ابتدائی تالیف "علم الاقتصاد" کا اصل مسودہ بھی عطیہ بیگم کے پاس ہے۔ ان سب چیزوں کو محفوظ کرنا بہت ضروری ہے۔ آثار اقبال کے سلسلے میں کئی نہایت اہم مآخذ اور بھی ہیں مثلاً:-

۱- اقبال نے بحیثیت قانون داں کے بہت سے مقدمات کی پیروی کی، ان مقدمات سے متعلق کاغذات کو بھی منظرِ عام پر لانا بہت ضروری ہے اس طرح یہ معلوم ہوگا کہ بہ حیثیت قانون داں کے اقبال کا کیا مرتبہ تھا۔

۲- پنجاب یونیورسٹی سے اقبال کا بہت گہرا تعلق تھا انہوں نے کئی جماعتوں کے امتحانی پرچے بنائے۔ وہ یونیورسٹی کے سینٹ اور دیگر ذیلی اداروں کے رکن یا سربراہ رہے پنجاب یونیورسٹی کے ریکارڈ سے اقبال کے بنائے

ہوئے پرچے، تجویزیں اور رپورٹیں وغیرہ مل سکتی ہیں۔

۳۔ سی آئی ڈی کے ریکارڈ میں بھی اقبال کی ذاتی فائل ہوگی اس سے بہت سی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں بشرطیکہ حکومت اس کی اشاعت کو مناسب سمجھے۔

**لغات اقبال:** عہد آفریں ادیبوں کا ذخیرہ الفاظ مطالعے کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ کیونکہ بڑے ادیب الفاظ مروجہ معنوں ہی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ ان میں مفاہیم و معانی کے اعتبار سے نئی وسعتیں بھی پیدا کر دیتے ہیں، بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض الفاظ میں کسی بڑے مصنف کے مخصوص استعمال سے بالکل نئے معنی پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کا کارنامہ نہایت وقیع ہے۔ اقبال نے اپنی اردو فارسی (نظم و نثر) تحریروں میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کا ایک لغت تیار کرنا چاہیئے۔ جن میں استعمال کی مختلف مثالیں بھی دی جائیں۔ تذکیر و تانیث یا دیگر قواعد سے اقبال نے جہاں کہیں روش عام سے انحراف کیا ہو اس کی نشان دہی بھی کی جائے۔ اسی لغت میں اقبال کی تلمیحات، اصطلاحات، اور تشبیہات و استعارات کو بھی شامل کر لینا چاہیئے۔ یہ لغت مطالعہ اقبال کے لئے بہترین معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی تشکیل ایسے اہلِ علم حضرات کے ہاتھوں ہو جو اقبالیات کے ساتھ ساتھ فن لغت نگاری اور لسانیت سے بھی کما حقہ آگاہ ہوں۔

**اقبال انسا ئیکلوپیڈیا:** چند سال قبل مولانا خیر بھوردی نے "غالب انسا ئیکلوپیڈیا" کی بنیاد ڈالی تھی اس کے نمونے کی چند قسطیں "نگار" میں شائع ہوچکی ہیں، ایسا ہی ایک "انسا ئیکلوپیڈیا" اقبال کے متعلق مرتب ہونا چاہیئے۔ جس میں

اقبالیات کے جملہ امور پر توضیحی حواشی ہوں ۔ یہ کام طویل بھی ہے اور وقت طلب بھی ۔ اس کے لئے پہلے موضوعات کی فہرست مرتب کرنی چاہیئے ۔ اور پھر مختلف اہلِ علم حضرات سے ان موضوعات پر لکھوانا چاہیئے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب تک اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سے کام کا مواد اس انسائیکلو پیڈیا میں شامل کر لیا جائے ۔

یہ ہیں چند تجویزیں، جن پر اقبال سے متعلق اداروں اور ماہرین اقبالیات کو توجہ کرنی چاہیئے ۔ ممکن ہے ان میں سے بعض موضوعات پر انفرادی طور پر یا کسی ادارے کے تحت کام ہو رہا ہو ۔ لیکن بہتر صورت میں یہ کام اسی وقت انجام پا سکتے ہیں ۔ جب تمام ادارے ہم آہنگ ہوں، اور اقبال سے دلچسپی رکھنے والے تمام اہلِ علم کا تعاون حاصل کریں ۔ ان اداروں کو تقسیم کار کے ساتھ ساتھ اشتراک عمل کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ تمام کام رفتار اور معیار کے اعتبار سے قابل قدر ہوں ۔ ورنہ اب تک تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ ادارے ایک دوسرے کے کام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔ یہ صورت حال افسوسناک بھی ہے اور نقصان دہ بھی ۔ اگر ان سب اداروں کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی بورڈ بنا دیا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ۔

جنگ کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء

مصباح الحق صدیقی

# اُمّتِ مُسلمہ کے اتحاد کی بنیاد

تاریخ عالم نے بہت سے ایسے عظیم انسانوں کو جنم دیا ہے۔ جنہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور خلوص سے نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے نوع انسانی کو تاریکیوں سے نجات دی۔ اقبال اسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایسے دَور میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے جب مسلمان بحیثیت قوم انحطاط کے عمیق غار میں گرنے والے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دوسری قوموں میں ایسے افراد اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم بحیثیت مجموعی ترقی کی منازل کی طرف بڑھ رہی ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ میں یہ ایسے دَور میں ظاہر ہوتے ہیں جب قوم موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہوتی ہے۔

اقبال ایسے ہی وقت میں پیدا ہوئے ان کے سامنے اعلیٰ و ارفع نصب العین تھا۔ مخالفت کی تند و تیز رو ئیں ان کے بلند عزائم کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔

انہوں نے عالم انسانیت اور خاص طور پر مسلمان قوم کو آئین بخشا۔ ابتدائی ماحول تو انہیں بھی ایسا ہی ملا جو عام انسانوں کو حاصل ہوتا ہے لیکن ان پر قدرت کی خاص نظر تھی۔ اس ماحول کے زیرِ اثر ہم ان کے یہ شعر سنتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس غیر ملکی تسلّط سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ان کے اشعار نے رات بھر میں ان کی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔

اقبال پر یہ حقیقت منکشف
ہوئی کہ یورپ نے اپنی ترقی
کے لئے رہنمائی اسلام سے
حاصل کی

قدرت نے اقبال کے لئے بلند مقام مخصوص کر رکھا تھا۔ جس کے لئے انہیں یورپ جانے کا موقع ملا۔ وہاں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یورپ نے اپنے دورِ عروج کے لئے رہنمائی اسلام سے حاصل کی تھی۔ اور آج بھی انسانیت کی تاریکیاں شمع اسلام سے دُور ہو سکتی ہیں۔ یورپ کے کتب خانوں میں ماضی کے اسلامی مفکّرین کی کتابیں پڑھنے پر اقبال کو اپنے دور کے لئے رہنمائی نصیب ہوئی۔ ان خیالات کو ذہن میں سموئے اور سینے میں ایک عزم صمیم لئے جب ہندوستان واپس آئے تو ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا....

کے بجائے انہوں نے قوم کو یہ نغمہ سُنایا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

محدود حلقہ سے نکل کر وسیع و عریض افق میں قدم رکھنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ اپنے نظریات کے لئے وسیع بنیاد تلاش کرتے۔ اس کے لئے ایسے وطن کی ضرورت تھی جہاں اسلامی نظریات کو عملی جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے مثال پیش کی جاتی۔ چنانچہ آزادیٔ ہند کا نعرہ بلند ہوتے ہی اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیٰحدہ وطن کی آواز اٹھائی۔ یہ امر آسان نہیں تھا۔ لیکن ایمان و ایقان کی قوت نے اس نصب العین کو حاصل کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

اس طویل جد و جہد میں اقبال نے بہت بڑا حصّہ ادا کیا۔ آج بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔

## تحریک پاکستان

اقبال نے مزاحمتوں کے باوجود بالواسطہ اور براہِ راست تحریک پاکستان میں قولاً و فعلاً حصّہ لیا۔ ایک طرف ان کے شب و روز برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں غور و فکر میں گزرتے اور دوسری جانب اپنی ملکوتی آواز سے مسلمانوں کے تن مُردہ میں جان ڈالنے میں مصروف رہتے۔ وہ مسلمان جو تقریباً موت سے ہمکنار ہو چکے تھے ان کے پیغام کے اثر سے آمادۂ عمل ہو کر جادۂ اسلام اور ایمان پر گامزن ہو گئے اس نصب العین نے انہیں اتحاد بخشا اور مزاحمتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیش قیمت قربانیاں دے کر پاکستان کو حاصل

کرکے دم لیا۔

جس شخص نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قربانیاں دی تھیں اسے پاکستان کو جیتی جاگتی حقیقت کی صورت میں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اس سے دس برس پہلے ہی دنیا سے رُخصت ہو چکا تھا۔ اس بات کا تصوّر کیجئے کہ اگر یہ مقصد ان کی زندگی میں پُورا ہو جاتا تو کیا ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہوتا؟ شاہی مسجد لاہور پر ہلالی پرچم کو دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین آتا؟ شاید فرطِ مسرت میں وہ مر ہی جاتے۔

اقبال یقیناً خوش قسمت تھے کیونکہ ان کا تعلق انسانوں کے اس زمرے سے تھا جنہیں مصائب جھیلنے میں مزا آتا ہے۔ یہ بہتر ہوا کہ ان کو موت ایسی حالت میں آئی کہ بستر مرگ پر پڑے دلی کرب و اضطراب میں مبتلا اور اسلام، خدا کے رسول اور مسلمانوں کی محبت میں تڑپتے تڑپتے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

## محبّتِ رسولؐ

اقبال کے جذبات میں محبت رسولؐ کو مرکزیت حاصل تھی۔ زندگی بھر اسی محبت کی گرمی سے سرشار رہے۔ اور اسی جذبہ کو سینے میں لئے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ اقبال سیاستدان تھے یا شاعر، اصل چیز یہ ہے کہ ان کے فلسفے کی روشنی میں ان کے مقصدِ حیات سے آگہی حاصل کی جائے۔ شاید ہی کسی فلسفی کا کلام اتنا مؤثر ہو جتنا اقبال کا شاعرانہ

کلام ہے۔ کمال یہ ہے کہ ادق مضامین کو ایسے سلیس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ موضوع پیرایۂ بیان میں اُلجھنے نہیں پاتا، اس کی مثالیں فیضیؔ اور عمر خیام ہیں جو کئی اوصاف رکھنے کے باوجود آج صرف شاعر کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اقبال کو بھی ایک دَور میں یہی صورت پیش آتی تھی۔ انہوں نے شکایت کی ؎

من اے میرامم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یقیناً اقبال محض غزل خواں نہیں تھے۔ ابتداء میں وہ برِصغیر میں پھیلے ہوئے اس خیال کے حامی تھے کہ شاعری قوموں کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ اس کے تحت قیام انگلستان کے دوران انہوں نے شاعری کو چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا۔ ایک ہموطن سے مشورہ کیا آخر فیصلہ ایک انگریز دوست پر چھوڑا گیا۔ اس نے شاعری نہ چھوڑنے کی تلقین کی۔ آج اگرچہ اقبالؒ ہمارے درمیان جسمانی طور پر موجود نہیں ہیں لیکن ہم ان کے شاعرانہ کلام سے راہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس واقعہ کا علم کم لوگوں کو ہے تاہم ہمیں ان کے فاضل انگریز دوست کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اقبال کے جوہر کو پہچان کر صائب رائے دی۔

## فلسفہ کی بنیاد

اقبال کا کلام قدرت کا حامل ہے وہ اپنے دَور کے نظریات کسی حد تک متاثر ہوئے اور اگر وہ اسلامی فلسفہ اور عشق رسولؐ سے سرشار نہ ہوتے تو جدید فلسفہ میں وہ اتنا اونچا مقام حاصل کرلیتے کہ ان کا شمار جدید فلسفیوں کی پہلی صف میں ہوتا۔ عشق رسولؐ اور تصوف نے انہیں اس دور کے فلسفہ کے

مقابلے میں آزادانہ غور و فکر پر مجبور کیا - ان کے فلسفہ کی بنیاد صداقت اور عشق رسولؐ ہے - یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے فلسفیوں کے مقابلے میں ان کا موقف منفرد حیثیت رکھتا ہے امکان موجود ہے کہ کوتاہ نظر لوگ اپنی غلط فہمی کی وجہ سے اقبال کے فلسفے کو غلط رنگ میں پیش کریں - لیکن اقبال کا فلسفہ سو فیصد اسلامیت کا حامل ہے - امید کی جا سکتی ہے کہ سلیم المزاج اور اسلام پسند مفکّرین اس پر غور و فکر کر کے اس کے خط و خال کو نمایاں کریں -

جدید فلسفہ اسلام کے مقابلے میں ایسے غائب ہو جائے گا - جس طرح سُورج کی موجودگی میں پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے - یہ سُورج اقبال کے فلسفے کی صورت میں طلوع ہو گا - عام آدمی اقبال کے فلسفے کو اندھیری رات میں چمکتے ہوئے تارے کی مانند خیال کرتے ہیں - کیونکہ اس کی بنیاد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے -

ہر وہ نظام فکر جس کی تہہ میں آخرت کا تصوّر نہ ہو، کسی مومن کے لئے ذرا بھی قابلِ اعتنا نہیں ہے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی پُرکشش کیوں نہ ہو - اقبال کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ کو مدنظر رکھا جانا بہت ضروری ہے -

اقبال کے پیشِ نظر صحیح راستہ یہ ہے ؎ بحق دلبند و راہ مصطفےٰ رو نبی صلعم کی بتائی ہوئی راہ انسان کو خوف آخرت، یوم حساب اور خدا کی حضوری کا تصوّر دلاتی ہے - اور اسلام کے فلسفہ کی بنیاد، یوم حساب کے تصوّر پر ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کا طرزِ فکر بھی اسی کا پابند ہے -

روح اور مادہ کے تصادم کے بارے میں اقبال کی رائے نہایت قیمتی ہے - یہ مسئلہ

اہمیت کے لحاظ سے بہت دُور رس ہے۔ کیونکہ انسانیت کے مستقبل کی تشکیل میں روح و مادہ کا تصادم زیرِ بحث آتا ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں نہایت اعتدال کی راہ بتائی ہے۔ اقبال نے جدید تہذیب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہر شعر ایسا قیمتی ہے کہ قاری ہیروں کی کان کی طرح فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس کو اُٹھائے ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکان نہیں
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سُورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال نے پوری امتِ مسلمہ کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ پوری دنیا کے اتحاد کے علمبردار تھے۔ اس اتحاد کے لئے وہ کسی سیاسی دباؤ کے قائل

نہیں تھے، وہ یہ یگانگت صحیح قسم کے جذبہ اخوت اسلامی کے ساتھ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس اتحاد کی بنیاد اسلام کے نظریہ حریت فکر و اظہار رائے اور مساوات ہے۔ ●●

ممتاز حسن

# سکون و حرکت
## اقبالؒ کی نظر میں

سکون و حرکت مادی دنیا کے حقائق میں سے ہیں اور علمی اور فکری موضوعات کی حیثیت سے سائنس اور فلسفے دونوں میں مشترک ہیں ۔ اقبال عملی سائنس دان نہیں تھے ۔ اور سکونیات اور حرکیات کے علوم طبعی میں کوئی تجرباتی کاوش ان سے منسوب نہیں ہے مگر فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے سکون و حرکت کے موضوعات ان کے نظام فکر میں ایک بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ان کی ابتدائی نظم کا ایک شعر ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

یہ ایک خالص فلسفیانہ شعر ہے جو نظام کائنات میں سکون و حرکت کے مقام کے متعلق ایک فلسفیانہ نظریہ پیش کرتا ہے اگرچہ اقبال نے مضمون کو اس خوبی

سے ادا کیا ہے کہ شعر کی شعریت اس فلسفیانہ معنویت پر پورے طور سے غالب آگئی ہے۔ یہ شعر ایک غیر جانبدارانہ مشاہدے کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ جیسے کوئی شخص دریا اور اس کے تلاطم کو ساحل پر کھڑا دیکھ رہا ہو۔ یہاں اقبال نے سکون و حرکت کے اخلاقی اور تخلیقی پہلوؤں سے بحث نہیں کی۔ مگر ان کی ساری شاعری اور سارے فلسفے نے اسی مسئلے کی فضا میں پرورش پائی ہے۔

سکون و حرکت روزمرہ کے انسانی مشاہدے میں مبادیات کا درجہ رکھتے ہیں ہم جب بھی دیکھیں ہمیں اپنے گرد و پیش کی کچھ چیزیں ساکن اور کچھ متحرک نظر آئیں گی۔ خاموش سے خاموش اور ساکن سے ساکن فضا میں بھی اور کچھ نہیں تو ہم اپنی آنکھوں، سانس، دل اور غالباً ہاتھ پاؤں کو متحرک پائیں گے۔ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی اور حرکت لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک انسان کے جسم اور اس کے دل کی حرکت باقی رہتی ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ جب یہ حرکت باقی نہیں رہتی اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ سکون و جمود اور عدم حرکت عدم زندگی کی علامات ہیں اور اگرچہ زندہ چیزیں گاہے گاہے عارضی طور پر یا بظاہر ساکن یا مائل بہ سکون نظر آتی ہیں۔ سکون کو کسی حالت میں زندگی کی خصوصیات نہیں کہا جا سکتا۔ زندگی کا تعلق زمان و مکان سے ہے۔ اسے ہر وقت کائنات کے زمانی اور مکانی فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں، اور ان مسافتوں کو قطع کرنے میں جو چیز ممد و معاون ہے وہ حرکت ہے سکون نہیں۔

سکون و حرکت کی طبیعی حیثیت کچھ ایسی پیش پا افتادہ قسم کی ہے کہ شروع شروع میں فلسفے کی نظر ان کی اہمیت پر نہیں پڑی۔ یونان کے قدیم ترین فلسفی تھیلیز کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کائنات کی زندگی کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ غور و خوض

کے بعد تھیلیز اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سرچشمہ پانی ہے جو زندگی کے سارے مظاہر کا منبع اور ساری موجودات کا مبدأ و معاد ہے۔ اسی طرح اینگزیمینز نے یہ رائے قائم کی کہ کائنات کا سرچشمہ پانی نہیں ہوا ہے۔ ان فلسفیوں کے سامنے حرکت اور تغیّر کے گوناگوں مظاہر تھے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ پانی، ہوا، اور مٹی بھی ایک صورت میں منتقل ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں نے تغیّر اور حرکت پر فی نفسہٖ غور نہیں کیا۔ سب سے پہلا فلسفی جس کی توجہ حرکت اور تغیّر کی اہمیت پر مرکوز ہوئی ہرقلیطوس تھا (پانچویں صدی ق م)

ہرقلیطوس نے کہا کہ کائنات کی بنیادی حقیقت تغیّر ہے۔ دنیا کی ہر شے عارضی اور گذراں ہے۔ کوئی چیز پائیدار نہیں۔ ہم ایک دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ دریا کا پانی ہر لمحہ نیا ہوتا ہے۔ اور جس پانی سے ہمارے پاؤں پہلی مرتبہ آشنا ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ پانی وہاں نہ ہوگا۔ نہ صرف ہر شے مسافر ہے۔ بلکہ جادۂ سفر خود بھی اوروں کی طرح مسافر ہے۔ موجودات میں ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ تغیّر ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو پائدار ہے۔

ہرقلیطوس کی تعلیم نے لوگوں کو متاثر کیا۔ مگر اسی کے زمانے میں پارمینی ڈیز اور زینو جیسے فلسفی بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن کا عقیدہ ہرقلیطوس کے عقیدہ کے برعکس تھا۔ یہ لوگ شہر ایلیا کے رہنے والے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حرکت اور تغیّر ناممکن الوجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر بالفرض کائنات میں حرکت اور تغیّر کا وجود مان بھی لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شئے عدم شئے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ ناممکن ہے حرکت اور تغیّر جو بذاتہٖ حرکت ہی کی ایک صورت ہے۔ ان کے بظاہر ہماری آنکھوں کے

سامنے آتے ہیں وہ محض ایک فریب نظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زینو نے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے اُڑتے ہوئے تیر کی مشہور مثال پیش کی۔ اس نے کہا کہ ہم بظاہر دیکھتے ہیں کہ تیر کمان سے چھُٹ کر اُڑتا ہوا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تیر نہ اُڑتا ہے اور نہ اُڑ سکتا ہے بلکہ وہ ہر متعین لمحے میں فضا کے ایک متعین نقطے پر ٹھیرا ہوا ہوتا ہے یعنی اپنی ظاہری اڑان کے دوران میں سارا وقت ساکن رہتا ہے اور اڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہرقلیطوس اور اس کے مخالفین کے نظریاتی اختلاف نے اپنا پرتو کم وبیش بعد کے زمانے کے سارے فلسفے پر ڈالا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ اعیان ثابتہ نے ایک ساکن، جامد اور غیر متغیر عالم مثال کا تصور پیش کیا۔ جس کا ایک دھندلا سا خاکہ افلاطون کے عقیدے کے مطابق ہمیں اپنی دنیائے آب وگل میں ملتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہمارے گردوپیش کی دنیا بے حقیقت ہے اور اس کا تخلیق کردہ عالم اعیان عین حقیقت، ہماری دنیائے محسوسات ناتمام اور نامکمل ہے اور اسی حرکت اور تغیر کی آماجگاہ ہے۔ حرکت اور تغیر اس دنیا کی ناپختگی کا پرتو ہیں۔ وقت کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ جاودانیت کا سایہ ہے۔

ارسطو نے جو افلاطون کا شاگرد تھا، اپنے استاد کے نظریۂ اعیان کو تسلیم کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ اعیان کسی اور دنیا کی چیز نہیں ہیں بلکہ ہماری دنیائے آب وگل ہی میں موجود اور کارفرما ہیں، عالمِ حقیقی کوئی اور عالم نہیں ہے یہی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں حقیقی دنیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک حرکت مادہ اور صورت، یا بقول افلاطون اعیان کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ یہ اتصال اور حرکت بے مقصد نہیں ہیں۔ ان کا مقصد

تخلیقی ہے۔ مادہ اور صورت کا اتصال اور امتزاج نو جو نتائج پیدا کرتا ہے یہی کائنات کا نصب العین ہے۔ حرکت کا آخری سرچشمہ ایک غیر متحرک ہے۔ (جسے ہم خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔)

اس سلسلے میں ارسطو اور افلاطون کے دو تین پیشروؤں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایمپی ڈوکلیز نے آب و آتش اور خاک و باد چاروں مفردات کو تسلیم کیا۔ اور حرکت اور تغیر کو ان مفردات کے اختلاط اور افتراق کا نتیجہ قرار دیا۔ انیگزاگورس نے مفردات کو چار کی بجائے لاتعداد گردانا۔ دیموقراطیس نے نظریۂ جواہر کی تعلیم دی اس کی نگاہ میں کائنات کی خشتِ بنیاد مختلف النوع مفردات نہیں ہیں۔ بلکہ لاتعداد اجزائے لایتجزی ہیں۔ جو ماہیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتے۔ وہ خود غیر متغیر ہیں۔ مگر ان کا باہمی امتزاج ایمپی ڈوکلیز کے عقیدے کے مطابق مفردات کے امتزاج کی طرح کائنات میں حرکت اور تغیر پیدا کرتا ہے۔ ان نظریوں کا بعد کے فلسفیوں پر جن میں مسلمان فلسفی بھی شامل ہیں گہرا اثر پڑا ہے۔ جو بجائے خود ایک مضمون ہے۔

اقبال نے سکون و حرکت کے فلسفیانہ مسئلے کا پہلے پہل اپنی تصنیف فلسفۂ عجم کے سلسلے میں جائزہ لیا۔ اس تصنیف میں انہوں نے ابن مسکویہ۔ اشراقیین۔ اور ملا ہادی سبزواری کے فلسفہ حرکت پر نظر ڈالی ہے۔ اور ان کے پیشرو یونانی فلسفیوں سے ان کے اتفاقات واضح کئے ہیں۔ یہاں اقبال کا انداز بیشتر مؤرخانہ ہے۔ نقادانہ نہیں۔ ویسے بھی اس کتاب میں اقبال کے بعض وہ ابتدائی تاثرات جھلکتے ہیں۔ جنہوں نے بعد میں ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کیں۔

اقبال کی مستقل فلسفیانہ تصنیف ان کے چھ لیکچر ہیں۔ جو دورِ حاضر کی اہم ترین فلسفیانہ تصانیف میں سے ہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے مذہبی تصوّرات کی تشکیل جدید ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جدید اور قدیم فلسفیوں کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے سکون و حرکت کے سلسلے میں زینو کے نظریۂ عدمِ حرکت پر ابوالحسن اشعری، ابن حزم، برگساں اور برٹرینڈ رسل کے خیالات کی روشنی میں بحث کی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اقبال کی دقیقہ رس نگاہ پر یہ حقیقت پورے طور سے واضح ہے: کہ موجودہ سائنس کی رو سے کائنات کی ہر شے ایک حرکت کے مترادف ہے۔ جوہر خود برقی قوت ہے نہ کہ برقی قوت سے متاثر شدہ کوئی شے۔ یعنی طبیعیات کی رو سے حرکت مسلسل کائنات کا بنیادی اصول ہے۔ اس نظریۂ مکانی کے ساتھ ساتھ اقبال کا نظریۂ زمانی بھی اصول حرکت کا حامل ہے۔ اقبال کی نگاہ میں وقت ایک تغیر مسلسل ہے۔ جس میں منٹوں، مہینوں اور سالوں کا حساب نہیں۔ اور جس کا تسلسل تواتر کی قید سے آزاد ہے۔ چھٹے لیکچر میں جس کا عنوان ہے "نظام اسلام میں حرکت کا اصول" اقبال نے قطعی طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ "ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے پرانے جامد و ساکن نظریے کا مخالف ہے اس کا تصوّر کائنات حرکی ہے۔"

حرکت اصولِ عمل ہے "قرآن خیال کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔" "اسلامی تحریک ایک زبردست پیغامِ عمل تھی۔" مگر وحدت الوجود اور اس کی شاعرانہ عجمی تفسیر نے عوام تک پہنچ کر اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔"

فلسفے کی طرح تصوّف اور مذہب کے میدان میں بھی سکون و حرکت یعنی موت و حیات کی راہیں نمایاں طور پر الگ الگ ہیں۔ ہندومت اور بدھ مت میں مکتی اور نروان کا

تخیل سکون وراحت کی طلب پر مبنی ہے اور سری کرشن کی تعلیم (جسے شنکر لی تفسیر نے نقصان پہنچایا ہے) حرکت اور جد و جہد کا پیغام ہے یہی حال مسلمانوں میں ابن عربی اور وحدت الوجود کے قائل دوسرے صوفیہ اور ان کے روحانی مقام فنا فی اللہ کا ہے۔ جو نروان کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اس کے برعکس مجدد سرہندی کی طرح وہ مسلمان صوفیہ بھی ہو گذرے ہیں۔ جنہوں نے فنا فی اللہ پر بقا باللہ کو ترجیح دی۔ یا بالفاظ دیگر زندگی اور عمل کو موت اور ترک عمل کے مقابلے میں اپنے لئے چن لیا۔

مسلمانوں کے علوم اور فلسفے پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب تک صحیح اسلامی ثقافت کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی حد تک مسلمان قوموں میں باقی رہی۔ ان کی زندگی اور تخیل کو سکون و جمود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ البتہ جب ان پر غیر اسلامی ثقافتی رجحانات غالب آ گئے تو ان کے پاس سکون و جمود اور اس کے لازمی نتیجے یعنی یاس و حسرت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ابن مسکویہ کا نظریۂ ارتقاء اور ابن خلدون کا نظریۂ تاریخ اسلامی ثقافت کے خصوصی نقطۂ نظر کے آئینہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حرکت اور جد و جہد اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور سکون و جمود سے اسے بنیادی طور پر نفرت ہے۔ اقبال ہر اس جذبے، ہر اس تصورِ حیات کے مخالف ہیں۔ جو انسان کو سکون و جمود کی طرف لے جائے۔ حکیم افلاطون اور خواجہ حافظ پر اقبال کی نکتہ چینی اسی وجہ سے ہے اور یہی وجہ ان کی اسلام سے محبت کی بھی ہے۔

اقبال نے ذوقِ عمل کی تجدید کے لئے ایک تو اسلامی افکار اور رجحانات کو غیر اسلامی افکار اور رجحانات سے جدا اور متمیز کرنے کی کوشش کی ہے

دوسرے زندگی کے اسلامی نصب العین کے تعین کی سعی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس

پیغام کے لئے کیوں منتخب کیا، یہ خود ان کی زبان سے سنیئے، ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں۔ "یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بیحد محبت ہے۔ لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھیرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔"

اقبال کی شاعری میں سکون و حرکت کا کیا مقام ہے؟ ان کے کلام کو ایک نظر دیکھا جائے تو ان کے ہاں ایسی نظمیں بہت ہی کم ملیں گی۔ جن میں سکون و راحت سے کسی قسم کی دلچسپی یا دل بستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسی نظمیں زیادہ تر ان کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ ان میں غالباً سب سے مشہور ان کی "ایک آرزو" ہے جہاں وہ دنیائے تنگ آکر کسی کنج عزلت کی تلاش میں ہیں ؎

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مگر یہ جذبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا حتیٰ کہ اسی نظم میں انہوں نے فطرت کے دلفریب اور راحت آموز مناظر کا تصوّر باندھتے باندھتے اپنے متعلق ایک ایسی تمنا کا اظہار کیا ہے جو سکون و راحت کے منافی ہے اور جس سے ان کے عیش و آرام کا پروگرام سارے کا سارا منسوخ ہو جاتا ہے ؎

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

دنیا سے بیزاری کا جذبہ اقبال پر شاذ و نادر ہی وارد ہوتا ہے۔ عموماً سکون کا تخیل ان کے ہاں مناظرِ قدرت سے خاص ہے۔ جیسے "خضرِ راہ" میں دریا کا نقشہ ؎

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

یا "نیکر کے کنارے کی ایک شام" ؎

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں سب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ محسوسات کی دنیا میں اقبال کو کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جسے انسان سے کوئی ہمدردی ہو ؎

کوئی نہیں غمگسار انسان
کیا تلخ ہے روزگار انسان

سکون و حرکت کے فلسفیانہ مسئلے کے بارے میں اقبال زینو کی بجائے ہرقلیطوس کے ہمنوا ہیں اور ان کے اشعار کہیں کہیں تو خود ہرقلیطوس کے اقوال معلوم ہوتے ہیں ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

یا

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

"بانگِ درا" کی نظم "چاند اور تارے" میں ان کا نقطۂ نظر اور بھی واضح ہے

؎ جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

اقبال زندگی کو ایک سفر جانتے ہیں ایک ایسا سفر جس کی منزل سوائے ذوق سفر کے کچھ بھی نہیں ؎

گفتم کہ شوقِ سیر نبردش بہ منزلی
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

زندگی کا سفر موت پر ختم نہیں ہوتا۔ خدا جانے کتنی زندگیاں اور ہیں ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی محض حرکت سے مطمئن نہیں ہو سکتی اس کا مقصد تخلیقی ہے۔ مورِ ناتواں کے لئے لطفِ خرام ہی زندگی ہے۔ اور موجِ دریا کی متاعِ زیست بھی اس کی روانی ہے۔ مگر انسان کو کچھ اور کرنا ہے۔ زندگی کی حرکت اقبال کے نزدیک نہ

صرف تخلیقی ہے بلکہ اس کا ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کی تخلیقی انفرادیت کو جسے اقبال خودی کہتے ہیں۔ اتنا بلند اور محکم کر دے کہ وہ سب سے اعلیٰ اور برتر انفرادیت یعنی خدا سے قریب تر ہو جائے تخلقوا باخلاق اللہ ہی منزل کا راستہ ہے۔ وہ قوت جو کائنات اور انسان کو تغیر کی راہوں سے گزار کر ایک بلندی سے دوسری بلندی پر لے جا رہی ہے۔ یہ نصب العین بھی اسی کا تقاضا ہے، انسان کی حرکت ارتقائی غیر محدود ہے اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی زندگی میں اس حرکت ارتقائی کی بہترین مثال ملتی ہے۔ ؎

بیتاب و تند تیز و جگر سوز و بیقرار
در ہر زماں بہ تازہ رسید از کہن گزشت

یہاں خیر البشر کی شخصیت میں اقبال نے اس خدائی صفت کا پرتو دیکھا ہے جو کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَانٍ کے بے نظیر الفاظ میں بیان ہوئی ہے اور یہ انسانیت کی معراج ہے۔ ••

آفاق ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر وحید قریشی

# اقبالؒ کی شاعری

شاعری کے اعتبار سے اقبال کے کلام کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دَور ان کی شاعری کے ابتدائی زمانہ کو محیط ہے جس میں انگریزی نظموں کے تراجم اور چربے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہ دور لب و لہجہ کے اعتبار سے اگرچہ ایک سمت کی نشان دہی کرتا ہے لیکن ابھی اقبال کے کلام میں وہ یک رنگی اور آواز میں وہ نکھار پیدا نہیں ہوا جو علامہ کی بعد کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ فکر و نظر کی ناہمواری اور زبان و بیان کی ناپختگی قدم قدم پر نمایاں ہوتی ہے۔ روایت سے کنی کاٹنے کا رجحان بھی جلوہ گر ہے۔ نتیجے کے طور پر فارسی کی تراکیب و تشبیہات و استعارات کی بھرمار تک نئی اور انوکھی لذت کا پتہ دیتی ہے لیکن اسلوب کا رکھ رکھاؤ اور جذبات کا ابلاغ ایسا گہرا اور پائدار ہے کہ دوسرے اس رنگ کو اُڑا نہ سکیں۔ ناسخ اور اُن کے معاصرین کی سی سالہ محنت، داغ اور اُن کے شاگردوں کی تحفظِ زباں کی کوششیں اپنا طلسم

کھولنے لگتی ہیں ۔ شاعری کی قلمرو میں ایک ایسی زبان وجود میں آئی ہے جو اقبال ناظر حسین ناظم ۔ غلام بھیک نیرنگ ۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی اور چکبست سب کو ایک نئی دنیا کا خواب دکھاتی ہے ۔ اقبال کا رنگ رنگِ محفل بن جاتا ہے ۔ ان بزرگوں کی منظومات کو اگر اقبال کی بانگِ درا کے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کوئی بڑا فرق دکھائی نہیں دیتا ۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اس طرز کی مقبولیت کے یقیناً اور اسباب بھی ہوں گے لیکن بڑا سبب تو یہ ہے کہ تھوڑی سی محنت سے ہر کوئی اس طرزِ گفتار کو اپنا سکتا ہے ۔

اقبال کے لئے یہ زمانہ نئے تجربوں اور زبان و بیان کے نئے نئے منصوبوں کا دَور ہے ۔ وہ بھی اگر اپنے مقلدوں کی طرح اسی ابتدائی حالت کے فریب میں آجاتے تو چکبست اور سرور سے زیادہ اہم ہرگز نہ ہو پاتے ۔ بانگِ درا میں ان کے جذبات پوری توانائی سے ظاہر نہیں ہوئے ۔ الفاظ و حروف پھبن دکھاتے ہیں لیکن بات اس منزل سے آگے جاتی دکھائی نہیں دیتی ۔ جسے مڈلٹن مرے

A BARREN IDIOSYNCRASY OF STYLE

قرار دیتا ہے ۔ چند الفاظ کے بار بار استعمال سے تو کسی اسلوب کی پہچان کوئی بڑا کمال نہیں ہے ۔ فارسی کی پُر شکوہ تراکیب اقبال کی آواز کی بنیادی خصوصیت سہی لیکن محض آواز کی عظمت ہمیں مسحور نہیں کر پاتی یہ دوران کی آواز کی آخری حد نہیں ہے یہاں سے ہمیں آتش، غالب، حالی، داغ اور دوسری کئی آوازیں بھی ابھرتی نظر آتی ہیں

جو فارسی تراکیب کی گھن گرج کے سامنے بھی اپنا اصل رنگ روپ نہیں مٹا سکیں روایت کا احساس اور اپنا راستہ بنانے کا خیال اقبال کو اس دور میں ابتکار اور جنٹلی سے پوری طرح روشناس نہیں کراتے۔ اس دور کی غزلیں پٹے ہوئے راستے کے نقش ہیں اور نظمیں بھی فارم کے اعتبار سے بالکل ابتدائی کوششیں معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرے دور میں اقبال روایت سے دبتے نظر نہیں آتے ان کی مخصوص آواز ابھرنے لگتی ہے جس میں رومی کی مثنوی کا ہلکا سا پرتو اور حافظ اور غالب کے کلام کا گہرا سایہ پڑا ہوا ہے۔ غالب بھی اس سے پہلے حافظ کے کوچے کی سیر کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں یہ راستہ ظہوری کے مسکن سے ہو کر گزرتا ہے اس لئے ان کا اپنا رنگ اقبال کے اس دور کے رنگ سے عام طور پر مختلف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اقبال کی بصیرت اسے اسی راستے پر بھی لا کھڑا کرتی ہے۔ غالب کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ اگر اقبال کا نام لے کر سنا دئے جائیں تو لوگ باور کر لیں گے۔ مثلاً

فرصت اگرت وقت دہد مختتم انگار
ساقی و مغنی و شرابے دو سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

کچھ عجب نہیں اقبال کو اپنے نئے اسلوب کا خیال غالب کے ایسے ہی اشعار سے ہوا ہو۔ لیکن یہ وہ منزل ہے جہاں دوسروں کا رنگ اقبال کے کلام میں جدا رنگ کے طور پر جھلکیاں نہیں مارتا بلکہ اس کی شاعری کے رگ و پے میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے یہاں ماضی کا ماضی پن بروئے کار نہیں بلکہ حال و استقبال کا گجر بھی اس میں شامل

ہے۔ اقبال دوسروں کے اسالیب کو اپنی ذات میں سمو کر ایک نئی آواز ایک انوکھا اسلوب اختیار کر لیتے ہیں، جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں قوت اور یکساں چمک دمک سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسرار و رموز میں ان کا پہلو ذرا رومی سے دبتا نظر آتا ہے جس سے ان کی مثنوی کی ہیبت پر ایک ہلکی سی اوپری تہ چڑھ جاتی ہے لیکن آگے چل کر یہ رنگ اقبال کے رنگ خاص میں گھل مل جاتا ہے۔ اس دور کی غزلیات و قطعات میں رومی کی جھلک اتنی نمایاں نہیں۔ پیامِ مشرق اور بالِ جبریل کے ابتدائی قطعے اس رنگ کو بھی جزوِ اسلوب بنا لیتے ہیں۔ اقبال کی بہترین کتابوں کا دور یہی ہے۔ شاعری اور فن کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے اردو میں بالِ جبریل اور فارسی میں پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کا جواب نہیں۔ فلسفیانہ رموز و معارف کے لئے اسرارِ خودی اور جاوید نامہ سرِ فہرست ہیں۔ یہ تو نہیں کہ اول الذکر کتابوں میں فلسفہ اجاگر نہیں بلکہ وہاں فلسفہ شاعری کی جان ہو کر رہا ہے۔ اسرار و رموز اور جاوید نامہ میں یہی کھیل ذرا نچلی سطح پر آ کر کھیلا گیا ہے۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم اور بالِ جبریل خالی خولی فلسفہ نہیں۔ جذباتی توانائی کے لحاظ سے یہ کتابیں اقبال کی شاعری کا نقطۂ عروج ہیں۔ ان میں اور دوسری کتابوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ یہاں جذبات اتنے پائدار اور ان کا اظہار اتنا جامع ہے کہ مختلف جذباتی سطحوں پر بھی تسکین کا بھرپور سامان ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری ان لمحوں کی پیداوار ہے جہاں انسانی جذبات بڑے تیکھے اور ان کا اظہار بڑا مکمل ہوتا ہے۔ شاعر کی ذکاوت زبان و بیان کے معمولی ذرائع سے گزر کر آفاقی رنگ و روغن اختیار کرتی ہے اقبال ایسے مواقع پر قدیم تشبیہات و استعارات کی نئی مخفی قوتوں کو ابھارتا ہے اور انہیں اپنی جذباتی یافت کا حصّہ بناتا ہے نئے علائم تراشتا ہے اور انہیں

کام میں لاتا ہے ۔ نئی تلمیحات وضع کرتا ہے اور حروف و اصوات کے لئے پیمانے ترتیب دیتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری میں انسانی جذبات کی ترتیب و تہذیب تخلیق کی موجِ سبک سیر اور ایک نیا آہنگ سامنے آتے ہیں ۔ بالِ جبریل کی غزلیات ، نظموں میں مسجد قرطبہ ۔ ذوق و شوق ۔ ساقی نامہ ، پیام مشرق کے قطعات ۔ فصل بہار ۔ سرودِ انجم ۔ حُدی ۔ کشمیر اور غزلیات نیز زبورِ عجم کی غزلیں اقبال کے اس دورِ شباب کی یادگاریں اور ہمارے شعری ادب کا بہترین سرمایہ ہیں ۔

اقبال کے ان جواہر پاروں کی نمایاں خصوصیت ان کی موسیقیت ہے اقبال موسیقی سے گہری واقفیت رکھتے تھے اردو کے قدیم شعراء میں سے بعض اس فن کے ماہر ہو گزرے ہیں ۔ لیکن عام طور پر شاعری اور موسیقی کے درمیان حدِ فاصل قائم رہی ہے متقدمین میں غالباً مصحفی کے سوا کسی نے بھی غزل میں موسیقی کی واقفیت سے کام نہیں لیا ۔ دورِ حاضر میں اقبال نے اسی فن سے لگاؤ کے سبب جُدا قسم کے ترنم کی داغ بیل ڈالی جس کی بعض آسان صورتوں کو حفیظ جالندھری نے بھی اپنایا لیکن یہ نغمہ اپنے زیر و بم کے طفیل عموماً ناقابلِ تقلید ہی رہا ۔ کیونکہ اس میں صاحب فن کی بصیرت نے بڑی پیچیدہ صورتیں اختیار کی ہیں ۔ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار میں اصوات کی ترتیب صرف بحر کے انتخاب اور بعض الفاظ کی تکرار کا کرتب نہیں ہے ۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
صورت نہ پرستم من بُت خانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبود من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں را نہ کہ ہستم من

---

ناقۂ سیار من، آہوئے تاتار من
درہم و دینارِ من، اندک و بسیار من
دولتِ بیدار من
تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

---

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن !
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

ان اشعار میں تکرار الفاظ اور بحور کی چلت کا پہلو بھی ہے لیکن آہنگ محض لفظوں کے حلقی یا لبانی ہونے پر منحصر نہیں، ہر شعر کا آہنگ الفاظ کی گزشتہ زندگی اور آئندہ امکانات سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہی موسیقی اس تکنیک کے بغیر مندرجہ ذیل اشعار میں بھی موجود ہے۔

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابانِ جنوں بردی و رسوا ساختی
جرم ما از دانۂ تقصیرِ او از سجدۂ
نے بآں بے چارہ می سازی نہ با ما ساختی
پرتوِ حسن تو می افتد بروں مانند رنگ
صورتِ مے پردہ از دیوارِ مینا ساختی
طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

حروفِ علت کے ان اجتماعات کے پیچھے موسیقی کا رچا ہوا ذوق اور جذبات کی اتھاہ گہرائیاں بھی ہیں جن سے شخصیت کا اظہار مکمل طور پر ہوا ہے۔

اقبال کی شخصیت نرگسیت اور احساسِ گناہ کا ایک بڑا دلچسپ آمیزہ ہے۔ خودی کا فلسفیانہ غلاف اس اظہارِ شخصیت اور پشیمانی کو ڈھانپے ہوئے ہے یہاں اقبال کے فلسفے کی اچھائی یا برائی سے بحث نہیں۔ یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فلسفۂ خودی کا تعلق اقبال کی شخصیت سے بھی ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ضمنی پہلو بھی اسی مرکز سے کسب فیض کرتے ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن دیگر خصوصیات

کے علاوہ قوت اور تسخیر کا مظہر بھی ہے۔ نطشے کے فوق البشر سے اس کا اتنا سا علاقہ ضرور ہے کہ شاہین اور شہباز کی خونخواری محض حیاتیاتی مسئلہ نہیں رہتی۔ اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے ہم آہنگ بھی ہے یہ رموز و کنایات اقبال کی شاعری کی بنیاد ہیں کیونکہ ان کی مدد سے اقبال نے اپنے عقائد کا اظہار ہی نہیں کیا، اپنے جذبات کی تسکین کا موقع بھی نکالا ہے۔ یہ طریق کبھی کبھی شوخیٔ رندانہ تک بھی جا پہنچتا ہے۔ جس کا احساس خود اقبال کو بھی ہے۔

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم ہر چہ از پاکان امت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس شوخیٔ رندانہ کی حدود اور ان کا رنگ بھی ملنڈ پڑنے لگا۔ جذبات دب جاتے ہیں اور فلسفہ زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور جذباتی انحطاط کا دور ہے۔ جوانی کی سرخوشی اور سرشاری کی جگہ کہولت نے لے لی اور اقبال کا فن بھی اس کی زد میں آگیا۔ بعض شعراء کی شاعری بڑھاپے میں جا کر جوان ہوتی ہے۔ شبلی کی مثال ہمارے سامنے ہے لیکن اقبال غالباً اتنے خوش قسمت نہ تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی عمر بھی ڈھلتی چلی گئی۔ آخر میں انہیں اپنی شاعری سے زیادہ پیغمبری پر اعتماد ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خطابت کے ان ذرائع پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے جو پیغمبروں اور اوتاروں کے لیے تو مفید ہو سکتے ہیں لیکن شاعر کو ان سے فائدہ ذرا مشکل سے۔

پہنچتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اشاعت پر اس بات کا شدید احساس انہیں خود بھی تھا جس کا ذکر مکاتیبِ اقبال میں ہوا ہے لیکن اس اعتذار کے باوجود اقبال کا یہ آخری زادِ راہ ثواب دارین ہے۔ شاعری کا شعلہ کہیں کہیں خاکستر میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق جذباتی سطح کا بھی ہے اور ابلاغ کا بھی۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اور اسی طرز کی دوسری نظمیں۔ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام کی ٹکر نہیں ہو سکتیں کیونکہ یہ مسئلہ محض فلسفیانہ خیالات کا نہیں۔ ان کے ادا کرنے کا ہے یہاں صاحبِ فن کے جگر کا لہو بھی رنگینی پیدا نہیں کر سکا۔ ●●

چٹان ۲۲-۴-۵۷

سیّد یونس شاہ ایم اے

# اقبالؒ کا پیغام
## عورت کے نام ،

ہماری انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی اہم پہلو ایسا نہیں ۔ جس کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کوئی حیات آفریں پیغام نہ چھوڑا ہو۔ انسانی زندگی سے متعلق جتنے اہم مسائل ہیں ۔ ان پر اس مفکّر شاعر نے کتاب و سنّت کی روشنی میں حکمت و بصیرت کے موتی چن چن کر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اقبال کی شاعری کی تمامتر اساس قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے ۔ یہاں تک کہ اکثر جگہ اقبال کے اشعار قرآنی آیات کا براہِ راست ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اس طرح اقبال کا پیغام اپنی ہمہ گیری اور وسعت کے اعتبار سے آفاقی رنگ لئے ہوئے ہے ۔

کلام اقبال کا مطالعہ کرتے وقت یہ امر ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ ان کا پیغام کسی ایک مخصوص ملک ، قوم یا قبیلے کے لئے نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی زد میں تمام عالم آتا ہے ۔ وہ جغرافیائی حدود کے قائل نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت کو مخاطب کرنے کی صلاحیت

رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے مخاطب بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال سالہاسال کے گہرے مطالعے اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور فطرت کے قریب تر ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ کہا۔ اور جس طرح کہا۔ اس میں مسلمان قوم کو مخاطب کرنا ناگزیر تھا۔

عورت کو اقبال کے کلام میں کوئی زیادہ حصّہ تو نہیں ملا۔ تاہم اُردو فارسی کے کلام میں بعض جگہ صنفِ نازک کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ اقبال کی بعض نثری تحریروں سے بھی ان کے خیالات کا علم ہوتا ہے۔ اقبال جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ عورت کی امومت کے فرائض ہیں۔ جن کے باعث اس کی ہستی معروف ہے اور اس کی ذات کا وجود قائم ہے۔ قدرت نے عورت کو نوع انسانی کی بقا کا ضامن بنایا ہے۔ اسی کے وجود سے دنیا قائم ہے۔ اقبال بھی عورت کی اس مسلّمہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے جمال اور حیاتیاتی اوصاف کے ثناخواں ہیں:۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوزِ دروں

اور پھر اس کی امومت کے مرتبے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں

فرض امومت دراصل ایک نہایت کٹھن اور جانگداز امر ہے۔ عورت اس مرحلے پر

ایک ذمہ دار ہستی کا رُوپ دھار لیتی ہے ۔ اس کی عقل اور اس کا شعور جب تک پوری قوت کے ساتھ کارفرما نہ ہو تو وہ اپنے حقیقی فرائض امومت سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی ۔ ماں کی گود کو پہلی تربیت گاہ کہا گیا ہے ۔ جہاں سے انسان عقل و دانش کے موتی سمیٹ کر عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ اگر ابتدائی مراحل میں قاعدے کی تربیت نہ ہو ۔ تو ظاہر ہے کہ سن شعور کے بعد کی تربیت چنداں سُود مند ثابت نہیں ہوتی ۔ ان حقائق کی بنا پر اقبال نے عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے ۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اقبال نے قدامت پرستی کا ثبوت دیا ہے ۔ اور وہ عورت کو جدید تعلیم سے بہرہ ور دیکھنا پسند نہیں کرتے ۔ یہ خیال جتنا مشہور ہے اتنا ہی بے سروپا اور بے بنیاد ہے ۔ اس ضمن میں اقبال کے ایک مضمون "قومی زندگی" سنہ ۱۹۰۴ء رسالہ مخزن کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے ۔

> "عمومیات کو چھوڑ کر اگر خصوصیات پر نظر کی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے ۔ عورت حقیقت میں تمام تمدّن کی جڑ ہے ۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے ۔ مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے ۔ دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصّہ جاہل مطلق رہ جائے ۔"

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے طریقہ کار کونسا ہو ؟ کونسی تعلیم مفید ہے اور کونسی مضر ؟ یہاں اقبال واضح طور پر مغربی طریقہ تعلیم سے اجتناب کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک فرنگی تعلیم اور معاشرے کے سبب ہمارے ملک کی تہذیب و معاشرت بگڑی ہے ۔ فرنگی تہذیب و تمدّن میں عورت کو کھلی

چھٹی دے دی گئی ہے وہ امومت کے فرائض سے گھبراتی ہے ماں بننے سے اُسے خوف آتا ہے وہ سائنس کی روشنی میں جدید تجربات سے فائدہ اٹھا کر مصنوعی نسل کشی کو ترجیح دیتی ہے ۔ وہ مرد کی اولین تربیت گاہ کی معلّمہ بننے کی بجائے ایٹم کی تھیوری پر تحقیق کرنے کو زیادہ پسند کرتی ہے وہ اپنے نونہالوں کو چھاتی کا دودھ اس لئے نہیں پلانا چاہتی ۔ کہ کہیں اس کے حُسن و شباب میں کمی واقع نہ ہو ۔ لیکن اقبال پکار پکار کر کہتا ہے کہ لذت تخلیق ہی سے عورت کی اعلیٰ اقدار وابستہ ہیں ۔ عورت کا ان حقائق سے روگردانی کا سبب فرنگی معاشرت کا ظہور ہے ۔ ؎

قصُور زن کا نہیں کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

فرنگی تہذیب میں بظاہر رنگینیاں نظر آتی ہیں ۔ مگر اندر سے اسے گھن چاٹ رہا ہے ۔ یہ بالکل کھوکھلی ہے ۔ اس کے چہرے پر سُرخی اور پاؤڈر کی تہیں جمی ہوئی ہیں ۔ جس کی وجہ سے اس کے حقیقی خدوخال پہلی نظر میں نہیں دیکھے جا سکتے ۔ اقبال نے اسلامی معاشرت کو عورت کی تعلیم کا مرکز قرار دیا ہے اور جا بجا وہ کردار و عمل کو مضبوط کرنے پر زور دیتے ہیں ۔ وہ اسلامی شعائر و روایات کو اپنانے میں عورت کی نجات سمجھتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں اقبال نے حضرت فاطمہ کے اسوہ حسنہ کی مثال پیش کی ہے جنہوں نے حضرت امام حسین رضؓ کی پرورش و تربیت کی ۔ اور اس طرح دنیائے اسلام میں سب سے پہلی اور بڑی انقلابی قربانی کا اضافہ ہوا ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

غرضیکہ اقبال کے ہاں عورت کی تعلیم یہی ہے۔ کہ وہ مذہبی روایات کی حامل اور پابند ہو۔ اصول خانہ داری اور حفظِ صحت کی تعلیم سے بہرہ ور ہو تاکہ امومت کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے۔ عورت کی بڑائی اور عظمت اسی میں ہے کہ وہ "مکالمات افلاطوں" لکھنے کے بجائے افلاطوں جیسے نامور ادیب و مفکر پیدا کرے۔ "رموزِ بے خودی" میں اقبال قوم کی اجتماعی بقا اور تحفظ کے لئے اس سادہ، گنوار اور تکلیف اٹھانے والی ماں کو مغربی تعلیم یافتہ عورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جسے ماں بننے سے انکار ہے اور جو اس تلخ حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتی۔ بظاہر وہ عورت ہے۔ مگر عورتوں کے جملہ اوصاف سے یکسر عاری ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسی عورت ہماری تہذیب و معاشرت کے اُجلے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے جسے ہر حالت میں دُھل جانا چاہیے۔ مشرق و مغرب کی عورت کا موازنہ بزبان اقبال ملاحظہ کیجئے ؎

آں دخ رستاق نزادے جاہلے
پست بالائے سطبرے بد گلے
دل ز آلام امومت کردہ خون
گرد چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ہستیٔ ما محکم از آلام اوست
صبح ما عالم فروز از شام اوست

وداں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرور و نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن باطن او نازن است
ایں گل از بستان ما نا رستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

غرضیکہ مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہے کہ ؎

مرد بے کار و زن تہی آغوش

اقبال ایسے علم کو وبالِ جان سمجھتے ہیں جو عورت کو مرگ امومت کا سبق دے اور جس کی تاثیر سے عورت، ناعورت بن جائے اور اس طرح اپنی اقدار کو خاک میں ملا ڈالے۔

؎ جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اور سچ تو یہ ہے کہ کون اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے انگریز کے نظامِ تعلیم اور طریقہ کار سے جو عظیم نقصان ملت بیضا کو ہوا ہے اس کی تلافی شاید کئی نسلوں تک

نہ ہو سکے۔ موجودہ دَور میں تو اس کے جراثیم حیرت انگیز طور پر پھیل رہے ہیں۔

آزادیٔ نسواں کے باب میں بھی اقبال کے ہاں وسعت نظر پائی جاتی ہے۔ آزادیٔ نسواں کا موجودہ نعرہ دراصل مغربی عورت کی شکست خوردہ آواز کی بازگشت ہے۔ مغرب سے پاک و ہند تک آزادیٔ نسواں کی جو لہریں پہنچی ہیں۔ ان کی نوعیت دو طرح کی ہے۔ ایک تو خود ارادیت۔ عزم اور مرد کو گھریلو امور سے بے نیاز کر کے اس کا ہاتھ بٹانے کی فکر انگیز تحریک ہے۔ دوسرے نسوانی آزادی کی وہ تحریک ہے جو سرمایہ داری کا کھلونا ہے۔ جس میں عورت غازے اور سُرخی سے پیدا کردہ مصنوعی حسن کی مدد سے مرد کو اپنا اسیر بنانا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ خود سرمایہ کی اسیر اور کنیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک نسوانی آزادی کا یہ گروہ سامراجی اور فرعونی حکمت کی پیداوار ہے۔ اقبال عورتوں کی ترقی کے ہرگز مخالف نہیں۔ بلکہ وہ ان طریقوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو اندھی تقلید کے زیرِ اثر اختیار کیے گئے ہیں۔ اقبال نے یہاں عالم نسواں سے مخاطب ہو کر ایک سوال کیا ہے۔ اور سرمایہ داری کی دنیا میں عورت کی تحریک آزادی کی دُکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔

اس مہاجنی دَور میں عورت ایک خطرناک دوراہے پر کھڑی ہے۔ وہ جذباتیت اور نعرے بازی کی وجہ سے اپنے اصلی مدعا اور اپنے مقصود کو فراموش کر دیتی ہے۔ وہ آزادیٔ نسواں کے مقابلے میں "زمرد کے گلوبند" کو ترجیح دے کر آزادیٔ نسواں کے المیے کا ڈراپ سین پیش کرتی ہے ؎

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند ؟

عورت جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں اپنی انفرادیت کا دم بھرتی ہے وہاں وہ پردے کی قید سے بھی آزادی کی خواہاں ہے۔ قدیم تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پردہ کا رواج آج کے دور کا اختراع نہیں بلکہ ابتدائے تہذیب سے اکثر ممالک میں اس کا رواج تھا۔ اگرچہ پردہ کی حدود متعین نہ تھیں تاہم ہر قوم اپنے شعور اور شرم و حیا کے مطابق پردہ کو اپنائے ہوئے تھی۔ رومن سلطنت میں پردہ کا رواج اور اس کی سختی اس شدّت کی تھی کہ عورتیں باہر جاتے وقت بھاری بھاری چادریں اوڑھتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی شکل کا نظر آنا تو درکنار ان کے جسم کی بناوٹ تک کا معلوم ہونا مشکل تھا۔

اقبال کے نزدیک عورت اپنے فرائض کو پردہ میں رہ کر بہتر طور پر ادا کر سکتی ہے۔ اسے بجائے جلوت نشین ہونے کے خلوت نشینی اختیار کرنی چاہیئے۔ اگر وہ شمع محفل بن گئی تو پروانوں کا ہجوم لازمی ہوگا اور اس کے نتائج مہلک ہوں گے۔ فرنگی معاشرت کا یہ ایک اور عطیہ ہے کہ عورت اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ برسرِ بازار کرتی پھرتی ہے اور اس طرح وہ قوانین فطرت سے جنگ آزمائی پر اُتر آئی ہے۔ آج کی عورت نے اپنے فرائض کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ جنس مخالف کی برابری کے خیال میں اپنے جلی اوصاف سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ نتیجہ تباہی و ہلاکت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

تفاوت نہ دیکھا زن و شوہر میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے یہ جلوت نشیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ آج جتنی خرابیاں دنیا کی تہذیب میں جڑ پکڑ چکی ہیں ان کی بڑی وجہ عدم پردہ ہے۔ اسلام نے نظام معاشرت کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں عورت کو پردہ کا پابند کیا ہے وہاں مرد پر بھی چند قیود عائد کی ہیں تاکہ مرد اور عورت دونوں شیطانِ رجیم کے مہلک ہتھیاروں سے محفوظ رہ سکیں۔ شیطان کے ہتھیاروں میں سب سے قوی اور زیادہ مہلک ہتھیار "نگاہ" کا ہے۔ نگاہ ہر فعل کی محرک ہے یہ دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرتی ہے اور اس طرح ان تمام تحریکات کا بنیادی عنصر بن جاتی ہے جن کی وجہ سے حضرتِ انسان مصائب و آلام میں گرفتار ہوتا ہے نظر کی آزادی حیوانی جذبات و خواہشات کو پہلے بیدار کرتی ہے اور ان کو عملی صورت بہم پہنچاتی ہے موجودہ دور میں جسمانی آنکھ تو روشن ہے مگر دل کی آنکھ خوابیدہ ہے۔ حالانکہ دیدۂ دل کی روشنی ضروری ہے جب نگاہ اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہے تو پھر دل و دماغ میں ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ، آئینہ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

اسلام نے نظروں پر پابندی عائد کی ہے تاکہ کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ رہے پردہ کی یہ ساری پابندیاں محض عورت کو مرد کی شہوانیت اور بربریت سے بچانے کے لئے لگائی گئی ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ منجملہ دیگر جذبات کے مرد کے اندر جنسیات کا جذبہ سب سے زیادہ قوی ہے اور یہ اس طوفان کی مانند کارفرما ہوتا ہے جس کے سیلاب

بیں زہد وریاضت کے محل خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں - اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورت پر جس نے نظر ڈالی ہے - وہ بحیثیت انسان کے نہیں بلکہ ایک مرد کی حیثیت سے اسے دیکھا ہے اس کی انسانیت کو ہمیشہ نظر انداز کر کے اس کی نسوانیت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے -

یورپ کا ایک ادیب وان ہیمر پردے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے -

"پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام قرار دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبے کو فنا کر دیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے ان کی ناموس وحفاظت کا اور ایک ذریعہ ہے ان کی رُسوائی کی روک تھام کا -"

اقبال کی فکر کا نچوڑ "خودی" کی شکل میں ظاہر ہوا اقبال اس بحث کو خودی کی روشنی میں دیکھتے ہیں جب تک تخلیق خودی کی منازل طے نہ ہوں مرد اور عورت دونوں اپنی ذات و صفات کو کماحقہ، نہ سمجھ پاویں اس وقت تک زندگی کی گاڑی کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا آج کے دور میں سخت مشکل یہی ہے کہ اپنے اپنے فرائض کی پہچان باقی نہیں رہی مرد اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے عورت کو ہر لحاظ سے اپنا محکوم اور غلام سمجھے بیٹھا ہے اور اس کا جواز مذہب سے پیش کرتا ہے (الرجال قوامون علی النساء) یعنی مرد عورتوں پہ حاکم ہیں - دراصل اس غلط ترجمے نے مردوں کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے - قوام سے مراد حاکم ہرگز نہیں بلکہ اس کے معنی کسی شئے کے محافظ، مدبر اور منتظم ہونے کے ہیں مرد چونکہ پورے خاندان کے نظم ونسق اور معاشی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے اس لئے اسے قوام کہا گیا ہے - اگر اسے کسی حد تک حاکمیت ہی تصور کر لیا جائے تو پھر بھی یہ حاکمیت مشروط ہے اگر وہ

حفاظت و نظامت نہیں کرتا یا مجرد رہ کر صرف اپنی ذات کا بوجھ برداشت کرتا ہے تو اس صورت میں وہ محض ایک مرد ہے قوام نہیں گویا قوامی فضیلت و برتری مستقل شے نہیں ہے بلکہ عارضی ہے عورت کی بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ وہ مرد کی قوامیت کا بہ دل و جان اعتراف کرے۔

عورت اور مرد کی جسمانی ساخت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے فرائض ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے چونکہ مرد کی تسکین و راحت کا سامان عورت کے پاس رکھا گیا ہے اس لئے قدرت نے اس کے اعضاء میں وہ سختی اور بڑائی نہیں رکھی جو مردوں کے ہاں ہوتی ہے عورت کو ایک خاص قسم کی نزاکت، لطافت، ملائمت اور خوبصورتی سے نوازا گیا ہے اور نسائیت کی بنیاد ہی اسی نرماہٹ اور ملائمت پر ہے اسی پر عورت کی قدر و قیمت کا انحصار ہے یہی فرق عورت کو مرد بننے یا اس کی ہمسری کا دعویٰ کرنے سے روکتا ہے اور اسے نوع انسانی کی حفاظت و تربیت کے فرض منصبی کی ادائیگی پر مجبور کرتا ہے اگر عورت کے جسم میں یہ فرق روا نہ رکھا جاتا تو پھر وہ عورت نہ رہتی بلکہ کوئی اور جنس بن جاتی جو اس وقت مغرب کے گلی کوچوں اور قہوہ خانوں کی زینت ہے۔

اقبال نے مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا پیغام دیا ہے۔ عورت میں جب یہ احساس پیدا ہوگا تو وہ اپنے اصلی مقام تک رسائی حاصل کر سکے گی ورنہ بقول اقبال

ے ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

تسنیم کوثر گیلانی

# اِقبال کے نقّاد

یہ تاریخ کی نہایت ہی سنگین حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ افراط و تفریط کی طرف مائل رہا ہے۔ اقبال کے متعلق غلط نظریات اور یک رُخی تنقید کی ایک بڑی وجہ اس کے فکر و کلام کے کسی ایک جزو کو کُل سمجھنا اور پیشتر سے قائم شدہ نظریہ کے مطابق اس کی تعبیر کرنا ہے اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ نئی بات نکالنے اور نیا نکتہ پیدا کرنے کی خواہش میں مبہم جاتے ہیں۔ یقیناً تنوع زندگی کا نمک ہے اور جدّت آفرینی تہذیب و تمدّن کی رونق۔ لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ اس خواہش کی تسکین کے لئے حقیقت ہی کو ہاتھ سے کھو دیا جائے اقبال کے کسی جزو کو کُل سمجھنے سے یا اپنے کسی مخصوص نظریہ کے مطابق اس کا مطالعہ کرنے سے مقام اقبال تک رسائی ممکن نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ آوازیں برابر آ رہی ہیں کہ اقبال نے نطشے کی خوشہ چینی کی ہے وہ برگساں کا رہین منّت

ہے۔ وہ فاشزم کا علمبردار ہے اور وہ اردو شاعری کا ملٹن ہے وہ فکر و نظر میں سرسیّد اور کمال اتاترک کا ساتھی ہے۔

آیئے، ذرا ان رنگارنگ بولیوں کا جائزہ لیں۔ نطشے کے فلسفہ کا نچوڑ جبر و قوّت ہے، خود سر اندھی، بے لگام اور بہیمانہ طاقت۔ اس کے نزدیک نیکی اور اخلاق دراصل ان کمزور انسانوں کے ایجاد کردہ ہتھیار ہیں۔ جن میں اتنی ہمّت نہیں ہوتی کہ طاقت کو طاقت کے نام سے حاصل کریں۔ یہ اُن اپاہجوں کے سہارے ہیں جو اقتدار پر کھلم کھُلا قبضہ کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔ یہ بزدلوں کا کام ہے کہ ان رنگین پردوں کی آڑ لے کر اختیار و اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں۔ زندگی کی ساری دھوڑ دھوپ بس اسی مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ خواہ ہوسِ اقتدار شعوری کی بجائے غیر شعوری اور کھُلی کی بجائے چھُپی ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کے سارے جذبات و افعال کو یہی اقتدار کی خواہش جنم دیتی ہے۔ چنانچہ نطشے کہتا ہے کہ محبّت کسی پر قبضہ جمانے ہی کا دوسرا نام ہے اور بیمار پرسی کا جذبہ اس کے سوا کسی دوسری خواہش کا نتیجہ نہیں ہے کہ بیمار کی بیکسی و لاچاری کے مقابلے میں اپنی صحت مندی اور برتری کا لطف اٹھایا جائے۔ نطشے کے نزدیک اخلاق کا آخری مظہر حیاتیاتی ہے اور اس میں میکیاولی کی خود غرضی اور ڈارون کی حیوانیت کا مکروہ مرکّب شامل ہے وہ اخوّت و جمہوریت کو تنازع للبقا اور بقائے اصلح کے سراسر خلاف بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ بین الانسانی، اختلافات میں ثالثِ مطلق کا درجہ انصاف کو نہیں بلکہ طاقت کو حاصل ہے۔ عزّت و آبرو اور ضمیر متضاد ہیں۔ ضمیر زندگی کی نفی اور راہبانہ روباہی کا تقاضا کرتا ہے۔ بخلاف اس کے آبرو کا اصلی منصب ذرعونیت ہے۔

اور یہ آمریت اور فاشزم کی صورت میں ہی جلوہ گر ہوتی ہے۔ نطشے ایک پُرجوش اور بلند بانگ دہریہ ہے۔ وہ خُدا کا مقام اپنے تصوّر کی تخلیق "فوق البشر" کو دیتا ہے جس کے حیاتیاتی اخلاق کا منتہا یہ ہے کہ اپنی اندھی تمنّاؤں، مُنہ زور اُمنگوں اور خود سر خواہشوں کو بہر حال پُورا کرے۔ حق و صداقت وہی ہے جو طاقتور کی خواہش کو دبائے اور چُھپائے اور نہ اس کی قطع و بُرید اور اصلاح و ترمیم میں سرگرداں ہو اس کو مذہب کی ہوا تک نہیں لگنی چاہیئے کیونکہ مذہب کمزور کر دیتا ہے۔ اس سے جوہرِ حیات زنگ آلود ہو کے رہ جاتا ہے۔

یہ ہے نطشے کا فلسفہ۔ اس سے اقبالیات کا موازنہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ برگسان کا فلسفہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا اثر اقبال میں تلاش کیا جائے۔ برگساں کے فکر کا مرکزی نقطہ "تخلیقی ارتقا" ہے۔ ارتقا کی وہ تعبیریں جو ڈارون اور دوسرے ماہرین حیاتیات کی اکثریت نے پیش کی تھیں۔ کم و بیش میکانکی تعبیریں تھیں جن سے بعض اہم سوال حل طلب رہ جاتے تھے۔ برگساں نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ زندگی اور ارتقا کی تحرک ایک ہمہ گیر قوّت ہے جسے اُس نے "الین وائٹل" کا نام دیا۔ اُس کے نزدیک کائنات اسی قوّت کی تخلیق اور مظہر ہے اور یہ قوّت مسلسل تغیّر اور ترقی کے مراحل طے کرتی رہتی ہے۔ انسان اور یہ کائنات پیہم تغیر کے سیلاب ہیں۔ ہمارا شعور خود ایک تبدیلی کی رَو اور تغیّر کا بہاؤ ہے۔ آخر کار برگساں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انسانی شعور۔ حقیقت اور تغیّر یہ سب ایک ہی ہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کائنات تمامتر تغیّر ہی تغیّر ہے تو پھر یہ بے شمار

اشیاء ہمیں ٹھوس اور ٹھہری ہوئی کیوں نظر آتی ہیں - برگساں اس کا جواب اپنے اس مشہور نظریہ کے ذریعہ دیتا ہے جس کے مطابق اس فریبِ جمود کی ذمہ داری عقل و دانش پر ڈالی گئی ہے - اصل حقیقت تو تغیّر کی بہتی ہوئی رَو ہے لیکن حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقل اسے مسخ کر کے پیش کرتی ہے - یہ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جامد صورتوں میں ہمارے سامنے لاتی ہے اصل حقیقت تک رسائی درکار ہے - تو عقل کے بجائے وجدان اور دانش کے بجائے جبلّت کو راہنما بنائے بغیر چارہ نہیں - پھر - برگساں اس نظریہ کی روشنی میں مسئلہ جبر و قدر پر بحث کرتا ہے کہ ایک فرد کی زندگی مختلف حصّوں کے جداگانہ جائزے سے تو ضرور جبریت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے - لیکن یہ محض عقل کا فریب اور فہم کا سراب ہے زندگی کے حصّے بخرے کرنے کی بجائے اُسے ایک غیر منقسم گروہ اور رواں دواں تخلیقی بہاؤ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے - مجموعی جائزے کا یہ زاویۂ نگاہ اس امر کو آشکارا کرتا ہے کہ انسان تغیّر اور تخلیق کے لئے قطعی طور پر آزاد ہے - یہ وجدانی زاویۂ نگاہ ہے -

اب دیکھئے کہ نطشے اور برگساں کا اثر اقبال کے فکر و شعر پر کیا ہے اور کہاں تک پایا جاتا ہے - کیا نطشے کی طرح اقبال بھی مجرّد طاقت کا نقیب ہے - ایسی طاقت جو اخلاق کے کسی گھٹیا سے گھٹیا تصوّر کی بجائے خود ہی معیارِ اخلاق ہو اور جو تمام انسانی معاشرے کو کسی ایک غرّاتے ہوئے بھیڑیئے کے سامنے بیکس خوفزدہ اور دبکی ہوئی بھیڑوں کا ریوڑ بنا کر رکھ دے ؟ کیا اقبال بھی بے لگام خواہشوں کی بے دھڑک پیروی کو نیکی کا نام دیتا اور نیکی کے تمام تصوّر کو بزدلی کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا ہے ؟ کیا اقبال بھی مذہب کو آکاس بیل سمجھتا ہے جو کسی کے جوہرِ حیات کو چوس کر پلے

بڑھے اور پھلے پھولے ؟ بلاشبہ اقبال کی نوا فریاد نزار نہیں ہے۔ اس میں ضعف و بیچارگی اور مغلوبی و محکومی کی پکار کے بجائے حرکت و عمل کش مکش و انقلاب اور غلبہ و استیلا کی صدائے رحیل ہے لیکن کیا محض یہ بات کہ اقبال غلبہ و قوت کا علمبردار ہے اُسے فطری طور پر نطشے کا رہین منت بنا دیتی ہے اور وہ صرف اسی وجہ سے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے ؟ سطح بیں اور سست فکر اصحاب کے لئے جلد ہی سے غرض مندانہ نتائج اخذ کر لینا سہل ہے اور اس کی مثالیں اس کے علاوہ بھی مختلف گوشوں میں آئے دن ہمارے سامنے رہتی ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ آئزن ہاور اور بلگانن دونوں بولنے کے لئے زبان سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا وہ دونوں ایک ہی بات بولتے ہیں اور یکساں خیال و نظر کی ترجمانی کرتے ہیں یا یہ کہ اظہارِ مدعا کے لئے زبان استعمال کرنے کا نکتہ ایک نے دوسرے سے چرایا ہے۔ بڑی طفلانہ سادگی سے یہ منطق چھانٹی جاتی ہے کہ نطشے بھی طاقت کا پیامبر ہے اور اقبال بھی۔ پس ظاہر ہے کہ یہ جو اقبال کے ہاں جا بجا قوت و حیات کے محرک اشعار پائے جاتے ہیں وہ نطشے ہی کے فیضان کا نتیجہ ہیں۔ عموماً روایتی سطحیت یہ اجازت نہیں دیتی کہ آگے بڑھ کر یہ تجزیہ کیا جائے کہ ان دونوں کے تصوّرِ طاقت کے ماخذ کیا ہیں۔ اور ان کے امتیازی خصائص کون سے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں کے تصوّرِ طاقت میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ نطشے کے مطلوب ہیں فرعون۔ نمرود۔ سکندر۔ چنگیز۔ ہلاکو۔ نپولین اور ہٹلر۔ اقبال کے راہنما نوحؑ و کلیمؑ، خلیلؑ و مصطفٰےؐ ہیں۔ اقبال کی تگ و تاز اگر ستاروں سے آگے کے جہانوں کے لئے ہے اور وہ مہ و پروین پر کمندیں ڈالتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معراجِ مصطفٰےؐ نے اس کے لئے اس راہ کی نشاندہی کی ہے۔ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

اقبال کا "مردِ مومن" سراپا قہر نہیں ہے بلکہ قہاری و غفاری، ستاری و جبروت کا عظیم مرقع ہے۔ اور وہ بلندی کا انتہائی عروج خودی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔

؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور یہ خودی کیا ہے؟ اقبال کے نزدیک خودی دراصل توحید ہی کا دوسرا نام ہے۔ ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ، فشاں لا الہ الاّ اللہ

اقبال کے فکر و شعر کا الہام یہی توحید کی حقیقت اور قرآن و سنّت کی تعلیم ہے یہ الہام اُسے پیدائشی مسلمان کی حیثیت سے محض ورثہ ہی میں نہیں ملا بلکہ وہ ایک طویل فکری مسافت کو طے کرنے کے بعد اور ذہن کی شدید ریاضتوں سے گذر کر اس مقام تک پہنچا۔ اس کی راہ میں مے و قمار کے جال تھے۔ حُسن افرنگ کی نیرنگیاں تھیں۔ مغربی فلسفہ کی پُر پیچ پگڈنڈیاں تھیں اور یورپ کی جہانگیری کا رعب و دبدبہ تھا۔ اگر کوئی اقبال سے کمتر انسان ہوتا تو عجب نہیں کہ رنگ و بُو کے فریبِ مشینی تمدّن کی چمک دمک اور کام و دہن کی سستی لذّتوں میں بھٹک کر رہ جاتا۔ اقبال اگرچہ ایک پست ماحول اور غلام معاشرے کی پیداوار تھا۔ لیکن فطرت سلیم رکھتا تھا۔ اس لئے نہ تو حواس کی ساحری میں گرفتار ہُوا اور نہ باطل نظریوں کی سامریت کا شکار، اس کی نگاہ اس حقیقت کو پا گئی کہ انتشار، تخریب اور تباہی کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں

کہ انسان نے اپنے دماغ کی ترنگوں کو عقل و دانش کا نام دے کر زندگی کی زمام سونپ دی ہے۔

افراد کے فکر اور معاشرے کے روابط کی صحت کا مدار توحید پر ہے خالص اور مکمل، بے لاگ و بے باک عمل و ہمہ جہتی توحید جو کائنات کی مابعد الطبیعاتی تعبیر بھی تسلّی بخش انداز میں کر دے اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں پائیدار، محکم اور حیات انگیز اصول بھی مہیا کر دے۔ جس میں کسی پہلو سے جھول نہ ہو اور کسی زاویہ سے کمی اور کجی نہ ہو۔ ایسی توحید کے مطابق جو زندگی اُبھرے گی اس میں بے حیائی کا نام ترقیٔ نسواں نہ ہوگا۔ فحاشی کا نام آرٹ نہ ہوگا۔ تخیل کے طلسم ہوشربا کا نام حقائق نہ ہوگا تمدن کا سرمایۂ فخر یہ نہ ہوگا کہ ایک طرف میخواری و عریانی، مکر و فن کی سودے بازی، اقتدار کی فرعونیت اور دھن دولت کی خون آشامی ہو اور دوسری طرف بھوک اور بیکاری، افلاس اور فاقہ کشی مظلومی اور خواجہ سرائی ہو ؎

نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و فسوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون!

طاقت و قوّت کسے درکار نہیں؟ زندگی کا ہر نظریہ، ہر نظامِ حیات اور بین الانسانی تعلقات کے بارے میں ہر طرز فکر و عمل، مختصر یہ کہ دنیا کا ہر دین اپنے قیام و نفاذ کے لئے طاقت و قوت کا طلب گار رہا ہے۔ ادیانِ باطل کے مقابلے

ہیں دینِ حق بھی کہ صحیح معنوں میں دین ہے ۔ غلبہ و تسلّط کا طالب ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جاہلیت کے اقتدار میں زمین کا چپّہ چپّہ ظلم و جور سے بھر جاتا ہے اور چنگیزیت کی چیرہ دستیوں سے لوگ جیتے جی مر جاتے ہیں ۔ لیکن جب زمامِ کار توحید کے ہاتھ آتی ہے تو زندگی کے خشک سوتے اُبلنے لگتے ہیں ۔ امن و انصاف کے لئے ترسنے والی دنیا گوہرِ مقصود کو پالیتی ہے اور صحیح ارتقا و ترقی کے دروازے کھُل جاتے ہیں ۔ نطشے کا فلسفہ زندگی ہو یا کسی دوسرے لادین صاحبِ فکر کا ۔ سب کا نتیجہ یہی ہے کہ زندگی زہر آلود ہو جاتی ہے ۔ اس کے برعکس اسلام جس قوّت و اقتدار کا حامل ہے وہ زہر کا تریاق ہے ۔ اقبال کہتا ہے ؎

تاریخ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحبِ نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک!
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک!

پھر ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور دین و سیاست کی جدائی اور مذہب و حکومت کی تقسیم کی ذمہ داری اس کور نگاہی پر ہے جس نے خدا کے حقوق و اختیارات ہی کو نہیں سمجھا جس نے مقامِ کبریا کو سرے سے پہچانا ہی نہیں ۔ چنانچہ اقبال خود نطشے ہی کے بارے میں کہتا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!

آپ نے دیکھا کہ نطشے اور اقبال کے موقف میں بعد المشرقین ہے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اقبال کے بارے میں یہ پراپیگنڈا کیا جاتا کہ وہ نطشے سے متاثر ہے اور اس کی طرح فسطائیت کا علمبردار؟ دراصل جو لوگ اقبال پر اس قسم کے الزامات لگاتے ہیں وہ اسے بے اثر اور بدنام کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقے کا وہ حصّہ جو اقبال کے واسطہ سے اسلام کے قریب آتا ہے اس سے بدک جائے۔ اشتراکیت کے پاکستانی ہمنواؤں کی طرف سے اقبال پر جو تابڑ توڑ حملے کئے جاتے ہیں۔ وہ کبھی تو گوریلا انداز میں ہوتے ہیں اور کبھی کھلم کھلا اور براہِ راست، موقع و محل کے مطابق جنگ کا ڈھنگ بدلا جاتا ہے۔ اقبال کے قارئین کو یہ لوگ دو حصّوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ایک حصّہ اُن پر مشتمل ہوتا ہے جن کے مطالعۂ اقبال کی غایت اُولیٰ خالص فکر و شعر ہے اور دوسرا حصّہ اُن پر مشتمل ہے جو اقبال کو زیادہ تر اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے پڑھتے ہیں اور اس ذہنی کاوش میں نہیں پڑتے کہ فکر و شعر کے میدان میں وہ کس درجہ کا شہسوار ہے، اشتراکیت زدہ تنقید اقبال کو ان دونوں پہلوؤں سے ہدف بناتی ہے۔ اوّل الذکر گروہ کے سلسلے میں اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذہن میں اقبال کی اسلامیت اُبھرنے نہ پائے۔ خالص فلسفہ کے میدان میں اقبال کو ایک مقتدی ظاہر کیا جائے۔ مقتدی بھی نطشے کا ایک ایسے شخص کا جس کے فلسفہ سے بدترین فسطائیت جنم لیتی ہے اور معاشرہ کسی فردِ واحد کی آتشِ ہوس میں جھلس جاتا ہے۔ اس طرح

اس گروہ کے متعلق یہ پالیسی اختیار کی جاتی ہے کہ وہ اصلی اقبال کے قریب پھٹکنے کے بجائے دُور بھٹک کر رہ جائے۔

نطشے کی پیروی، فسطائیت کی ترویج اور جبریت کی تبلیغ کے الزامات کے علاوہ اقبال کو برگساں سے بھی متاثر بتایا جاتا ہے۔ دونوں کے خیالات کا خلاصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ تخلیق وارتقا اور زمان و مکان کے بارے میں برگساں کے تصوّرات اس فلسفہ آرائی کا نتیجہ ہیں جو ایک یونانی فلسفی ہیرکلیس اور دوسری طرف حیاتیاتی فلاسفہ کے خیالات کا مرکّب تھی۔ اس کے برعکس اقبال کا تصوّر زمان و مکاں توحید ہی کا ایک پہلو ہے۔ ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ!

یقیناً اقبال برگساں کی طرح خِرد کو زندگی کا گمراہ کن راہنما سمجھتا ہے لیکن جہاں برگساں جوئیبارِ زندگی کے صحیح بہاؤ کے لئے مجرّد وجدان کو قیادت کی باگیں سونپ دیتا ہے، وہاں اقبال خِرد کو رد کر کے عشق کو راہنما بناتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عقل و عشق کی حقیقت کیا ہے؟

؎ عشق تمام مصطفےٰؐ، عقل تمام بولہب!

اس عشق و خودی کے جذبہ سے سرشار ہونے کے بجائے جو لوگ برگساں کے ملمّع ساز فلسفہ کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو جاتے ہیں۔ اقبال انہیں دریوزہ گری پر ٹوکتا ہے۔ ؎

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناریٔ برگساں نہ ہوتا!

لہ فکری سازش کے تحت اقبال کو آتاترک کے دوش بدوش کھڑا کر سکے۔

آخر میں اقبال پر تنقید کے اس پہلو کو لیجئے جس کے لحاظ سے شعر و شاعری میں اقبال کی حیثیت ملٹن کی سی بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ملٹن کی طرح اس کی ہر دلعزیزی اور شہرت کا ستارہ اس مخصوص مذہب کی مانگ کم ہونے پر جس کا وہ ترجمان ہے خود بخود ماند پڑ جائے گا۔ دراصل یہ تنقیح غلط فہمی کا ایک عبرت ناک پس منظر رکھتی ہے۔ یہ رائے اس مفروضہ پر قائم کی گئی ہے کہ ملٹن اور اقبال دونوں کے تخیل پر مذہب یکساں طور پر مسلط ہے۔ حالانکہ سینٹ پال کی عیسائیت نے تاریخ کی مختلف منازل میں جو شکلیں بھی اختیار کیں وہ سب کی سب گرجاؤں اور راہب خانوں میں تو راہنما بن سکتی تھیں مگر زندگی کی گہما گہمی اور ہماہمی ان کے بس سے باہر تھی۔ اگر ملٹن کا راہنما مسیحؑ کا اسلام ہوتا تو بات دوسری ہوتی۔ لیکن جب عیسائیت کی تگ و دو گرجا کی چاردیواری تک محدود رہی اور اس نے زندگی سے گریز اور فرار ہی کو ذریعۂ نجات سمجھا تو ملٹن کے کلام سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی کی جاوداں اقدار کا عکاس ہوگا۔ زندگی کا جوہر اس کا سوزِ دروں، اس کی پیکار پیہم، اس کی تپش، اس کی ان گنت اُلجھنیں اور اس کے سلجھاؤ کا بے خطا ڈھنگ معلوم کرنا ہو تو اقبال کے کلام کی تر و تازگی سے معلوم کیجئے۔ اقبال کے فکر سے لغزشیں سرزد تو ہوئی ہیں لیکن ان کی نوعیت اور تعداد ایسی نہیں کہ جس سے اقبال کا موقف و مقام مشتبہ ہو جاتا ہو۔ وہ اسلامی تہذیب کا فرزند ہے فکر افرنگ کا خیمہ بردار نہیں۔ اور بجا طور پر "ترجمان حقیقت" کہلاتا ہے۔ ۲۲